1

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجموعہ مطبوعات بہادر ~~[illegible]~~ قائد ملت اکیڈمی کی یہ پہلی کتاب ہے

جس میں ۲۳۲ عنوانات کے تحت قائد ملت کے ۱۰ مضامین

باقی ۲۲ تقریظ، مقدمۃ الکتاب، تعارف، آرا وغیرہ

کے زیر عنوان نواب صاحب کے نگارشات شامل کتاب

ہیں

یہ کتاب بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس

کتاب کے ذریعے پہلی بار قارئین کو نواب صاحب

کے علمی جواہر پاروں سے استفادے کا موقع ملا۔

نذیر الدین

نگارشاتِ بہادر یار جنگ

مرتبہ :- نذیر الدین احمد

Shaik Bodhan.
BOOK BINDER.
Resedent, Patther Ki Masjid,
16-9-985 Chanchalguda, Hyd-A, P.

نگارشاتِ بہادر یار جنگ

— مُرتّبہ —

مولوی نذیر الدین احمد صاحب
میونسپل کونسلر

☆

— بہ اہتمام —

ابراہیم بن عبداللہ مسقطی

انتساب

اگر بیگم قائد ملت نے گھر بار کی گراں بار
ذمہ داریوں سے نواب مرحوم کو مستغنی نہ کر دیا
ہوتا تو قائد ملت کی گراں بہا خدمات سے
قوم محروم رہتی۔

نگارشات بہادر یار جنگ کو بیگم صاحبہ
کے نام معنون کرنے کی عزت حاصل
کرتا ہوں۔

نذیر الدین احمد
میونسپل کونسلر

طبع اول - ۱۰۰۰

تاریخ اشاعت - فبروری ۱۹۶۸ء

قیمت - ایک روپیہ پچاس پیسے

کتابت - محمد مظفر الدین محمود

طباعت - اعجاز پرنٹنگ پریس

سرورق ڈیزائن - ایم - اے، غفار آرٹسٹ

طباعت سرورق - یووا پریس

بہ اہتمام - ابراہیم بن عبداللہ مسقطی

ملنے کے پتے - ۱- انجمن مہدویہ چنچل گوڑہ - حیدرآباد

۲- ادبی ٹرسٹ بک ڈپو

کنارا بنک بلڈنگ، عابد روڈ حیدرآباد

۳- حیدر اینڈ سنس

مچھلی کمان - حیدرآباد -

ترتیب

مُقَدّمہ .... نذیر الدین احمد۔ میونسپل کونسلر حیدرآباد

تقریظ
مولوی سید خلیل اللہ حسینی صاحب
صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت و پرنسپل انوار العلوم کالج

نشان سلسلہ	عنوان مضمون	صفحات
۱	حضرت بندگیمیاں سید محمود ثانی مہدی رضؓ	۱ تا ۱۳
۲	علامہ بحر العلوم شمسی	۱۴ تا ۲۶
۳	مہدوی فرقہ کے اصول اور حالات	۲۷ تا ۳۰
۴	عبادت	۳۱ تا ۴۰
۵	اصلاح ملت	۴۱ تا ۴۴
۶	عقد بیوگان	۴۵ و ۴۶
۷	عقد بیوگان	۴۷ و ۴۸
۸	شاہ عثمان زندہ باد	۴۹ تا ۵۲
۹	حیدرآباد اور گھریلو صنعتیں	۵۳ تا ۵۸
۱۰	میں مطالعہ کس طرح کرتا تھا	۵۹ تا ۶۳
۱۱	جلاح پہلی نظر میں ـــــ ایک تاثر	۶۴ تا ۶۶

نشان سلسلہ	عنوان مضمون	صفحات
۱۲	شاعری	۶۷ تا ۷۱
۱۳	فطرت کائنات	۷۲ تا ۷۴
۱۴	فن تقریر	۷۵ و ۷۶
۱۵	شاعر کا قلم	۷۷
۱۶	دیہاتی زبان کا شاعر	۷۸
۱۷	مرکزیت اور اجتماعیت	۷۹ و ۸۰
۱۸	اخبار اور پریس کی دنیا	۸۱ و ۸۲
۱۹	اخبار وقت	۸۳
۲۰	نظر حیدرآبادی	۸۴
۲۱	فرشتۂ رحمت	۸۵
۲۲	نصب العین	۸۶ و ۸۷
۲۳	مذہب اور سیاست	۸۸ تا ۹۰
۲۴	شمع ہدایت	۹۱ و ۹۲
۲۵	شانِ نزول	۹۳
۲۶	اصلاحی خدمات	۹۴
۲۷	حج بیت اللہ	۹۵ و ۹۶
۲۸	فنون لطیفہ	۹۷ و ۹۸
۲۹	نیا قرآنی قاعدہ	۹۸
۳۰	تفسیر	۹۹ و ۱۰۰
۳۱	تفسیر سورہ فاتحہ	۱۰۱ تا ۱۰۷
۳۲	قائد اعظم کی تقاریر	۱۰۸ تا ۱۱۲

تقریظ

مولوی سید خلیل اللہ حسینی صاحب
صدر کل ہند مجلس تعمیرِ ملت
و پرنسپل انوار العلوم کالج

اِنسانی تاریخ، حالات کے چیلنج اور اس کے ردِ عمل کی داستان ہے۔ افراد اور جماعتیں، اگر زمانہ کے چیلنج کا جواب نہیں دیتیں، میٹ دی جاتی ہیں، انھوں کا جواب افراد کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے، ایسے افراد ملت کے مقدر کا ستارہ ہوتے ہیں۔ جو قوموں کے ردِ عمل کا مظہر ان کے خوابوں کی تعبیر اور اُن کی اُمیدوں کی تکمیل کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ لسان الامت قائدِ ملت بہادر یار جنگ مرحوم ایک ایسے ہی مردِ حوصلہ مند، دیدہ ور اور دانائے راز تھے، خوفِ الٰہی میں بیدِ لرزاں کا عالم، عشقِ محمدیؐ میں موجِ طوفاں کا جوش و خروش، نرم، دمِ گفتگو اور گرم دمِ جستجو، جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم، اور دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان،

بہادر خان یا یار جنگ نہ صرف دنیائے اُردو کے بے نظیر خطیب تھے بلکہ کردار کی پاکیزگی کا وہ عالم تھا کہ گویا عہدِ صحابہؓ کا پرتو سامنے ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم نے اس گوہر یک دانہ کی مناسب قدر نہیں کی۔ اس بولتے ادیب کی تقریریں، تفصیلات اور احوال کو محفوظ نہیں رکھا۔

ابوریحان البیرونی نے ہندو تہذیب اور ہندوستان کو الُف کو قلمبند کرنا چاہا تو اس کو آریاؤں کی اسی سرد مہری سے سابقہ پڑا جو آج مسلمانوں کی خصوصیت بن گئی ہے کہ اپنے احوال کا ریکارڈ رکھنے کا بھی حوصلہ نہیں رہا ہے۔ اِمکان تھا کہ زمانہ بہادر یار جنگ کو پوری طرح بھلا دیتا اور یوں قدرت کے ایک بڑے احسان کو ناشکری کی نذر کر دیا جاتا کہ اس شمع خطابت سے مستنیر ہونے والے خطیب جناب نذیرالدین احمد صاحب نے اس کام کا بیڑا اٹھایا، نواب صاحب کی تحریرات کو جمع کرنے کی مہم سر کی، اس چھوٹی سی کتاب کی تیاری کیلئے بھی نذیرالدین احمد صاحب کو کتنی صعوبت اٹھانی پڑی ہوگی اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو مسلمانوں کی موجودہ افتادِ ذہنی سے واقف ہیں۔

زیر نظر کتاب زیادہ تر نواب صاحب کی ابتدائی تحریرات کا مجموعہ ہے اس میں ان کے جوشِ مہدویت کی بھی جھلک ہے، اور آصف سابع سے بے انتہا عقیدت کا اظہار بھی، ہم جس بہادر یار جنگ سے روشناس ہیں، وہ مردِ قلندر ہے، جس نے فرقوں کی تنگ نائیوں سے خود کو آزاد کیا ہے، ملت اسلامیہ کے لئے جاگیر چھوڑی ہے بادشاہت سے ناراضگی مول لی ہے، اور ہر وابستگی سے منہ موڑ کر، خدا سے رشتہ جوڑ لیا ہے، ایسے مردِ خود آگاہ، وخدا مست کے ابتدائی اور ارتقائی لمحات سے آگہی کے لئے یہ کتاب مفید ہے، یوں بھی دوست کا ہر نقش قدم، دامن دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے، پیشانی جھک جاتی ہے، پلکیں نمناک ہو جاتی ہیں، اور دل کی دنیا میں یادِ محبوب، ایک مسرت دیر ہنگامہ مچا دیتی ہے۔

نذیرالدین احمد صاحب کی محنت مسعود، اور کوشش کامیاب ہے۔

ہمیں توقع رکھنا چاہیئے کہ قائدِ ملت بہادر یار جنگ کی ساری تحریریات، خطبات اور تقاریر شائع کرنے کا جو منصوبہ باہمت مرتب نے بنا لیا ہے، وہ پورا ہوگا اور اس سلسلہ میں انھیں ہر وہ تعاون میسر ہوگا جس کے بغیر کتنے ہی اچھے منصوبے ادھورے رہ جاتے ہیں!

سید خلیل اللہ حسینی
۳۰-۱-۶۸ء

نذیر الدین احمد میونسپل کونسلر
مرتب کتاب

مُقدّمہ

قائدِ ملت کے ایک عقیدت مند کی حیثیت سے ایک عرصے سے یہ خیال تھا کہ نواب بہادر یار جنگ کے مضامین شائع ہوں۔ جب اس راہ میں تلاش و جستجو کا سلسلہ شروع ہوا تو مضامین کے علاوہ سفرنامہ اور مکاتیب بھی دستیاب ہوئے۔ حضرت قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ کی تحریری یادگاروں کی اشاعت کی اس پہلی کڑی "نگارشاتِ بہادر یار جنگ" میں ابتدائی زمانے کی تحریریں زیادہ ہیں۔ پہلا مضمون "المصدق" میں حضرت بندگیمیاں سید محمود ثانی مہدی رض پر چھپا، ایک اور مضمون "مہدویہ فرقے کے اصول اور حالات بھی شریک کتاب ہے، ان ہر دو مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ نواب صاحب پر ابتدائی زمانے میں، اپنے فرقہ کا رنگ زیادہ گہرا تھا

لیکن جمال الدین افغانی کے خواب کی تعبیر اور اقبال کے اس شاہین زادے نے سب سے پہلے اپنے آپ کو فرقوں کی تنگ نائیوں سے آزاد کیا۔ اور ملتِ اسلامیہ کے خدمت گزار کی حیثیت سے پرستاران رب کعبہ کے متعینہ مقصدِ حیات کے حصول کے لئے سرگرمِ عمل ہوا۔ اور پھر ملتِ اسلامیہ کا روحِ رواں بن گیا۔ قوم نے اسے آنکھوں پر بٹھایا، دل میں جگہ دی، اور جب یہ نظروں سے اوجھل ہوگیا تب بھی دل سے دور نہ ہو سکا۔

اس کتاب میں نواب صاحب کے متذکرہ دو مضامین کے علاوہ

۸ مضامین عام دلچسپی کے شریک کتاب ہیں۔ مذہبی مضامین میں ایک مضمون عبادت ہے، اس مضمون کی ہر سطر میں قاری کو ایک تڑپتا ہوا قلب ہر سطر میں ان کی رہبری کرتا ہوا محسوس ہوگا۔ اور وہ یہ بھی محسوس کریں گے کہ اکابرینِ سلف کی یادگار عادتوں کے حامل کسی بندۂ حق نے خونِ دل و جگر میں انگلیاں ڈبو کر یہ مضمون لکھا ہے۔

حیدرآباد اور گھریلو صنعتیں، میں مطالعہ کس طرح کرتا تھا؟ علامہ شمسی کے زیرِ عنوان دلچسپ اور معلوماتی مضامین آپ کو ان اوراق میں ملیں گے۔ اور ساتھ ہی فطرت کائنات اور شاعری کے عنوان پر دو ایسے مضامین بھی، جن کی تحریر کا رنگ دیکھ کر نثر پر نظم کا گمان ہوتا ہے۔

نگارشاتِ بہادر یار جنگ کی ترتیب کے وقت اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ ابتداً مذہبی مضامین بعد سیاسی و ادبی مضامین ہوں اور پھر تقریظ، تبصرہ، رائے وغیرہ اس طرح یہ کتاب ابتدائی صفحات کو چھوڑ کر ۹۸ صفحات پر مشتمل تھی لیکن بعد ازاں سفرنامہ بہادر یار جنگ کے مسودات میں تفسیر، اور تفسیر سورۂ فاتحہ کے تحت نواب صاحب کے دو مضامین ملے اور ان مضامین کی کتابت کے دوران قائدِ اعظم کی تقاریر پر نواب صاحب کا لکھا ہوا مقدمہ بھی دستیاب ہوا۔ اور اس طرح ترتیب دیئے ہوئے تسلسل میں کچھ فرق آیا۔ مگر ان مضامین کے علاوہ، فنِ تقریر، شاعر کا قلم، قائدِ اعظم کی تقاریر پر لکھا ہوا مقدمہ، دیہاتی زبان کا شاعر اور اخبار وقت پر لکھا ہوا پیش لفظ، مرکزیت اور اجتماعیت، اخبار اور پریس کی دنیا کے زیرِ عنوان لکھا ہوا پیام، فرشتۂ رحمت پر تبصرہ، نظر حیدرآبادی کا تعارف، نصب العین، شاہ عثمان زندہ باد کے زیرِ عنوان تاثرات، مذہب اور سیاست، شمعِ ہدایت

پر تقریظ، شانِ نزول، اصلاحی خدمات، حج بیت اللہ، فنون لطیفہ پر
روشنی ڈالنے والے بھی شریک کتاب ہے۔

اس کتاب میں شاہ عثمان زندہ باد کے تحت نواب صاحب کے جو تاثرات درج ہیں۔ اس مضمون سے کسی بھی غلط فہمی کا امکان ہے۔ نواب صاحب کے درج ذیل مکتوب کو بھی پڑھ لینا ضروری ہے۔

"دل چاہتا ہے کہ جذبات قلب صفحۂ قرطاس پر رکھ دوں، احتیاط گریباں گیر ہے۔ لیکن سنیئے کہہ دیتا ہوں کہ حکومت میری نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کو اسلامی حکومت کہنا، اسلام کے لئے باعث ننگ و عار ہے، مجھے اعتراف ہے کہ خاک حجاز اقبال کے الفاظ میں خشت بنیاد کلیسا بن گئی ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہماری ساری اُمیدوں کا مرکز اور ساری آرزوں کا آخری ٹھکانہ مجبور اور دوسروں کا محتاج ہے۔

اسلامی سلطنت کے تصور میں جی رہا ہوں اور اسلامی سلطنت کو پیدا کروں گا یا اسی تصور میں دنیا سے آنکھ بند کر لوں گا۔" (قائد ملت کا خط مولوی غلام محمد صاحب وکیل نظام آباد کے نام)

آخر میں میرا خوش گوار فریضہ ہے کہ میں ان اصحاب کا شکریہ ادا کروں جنھوں نے نگارشات بہادر یار جنگ کی تیاری میں میری مدد فرمائی۔ سب سے پہلے میں میرے مخلص کرم فرما مولوی کرم علی خان صاحب، مولوی شاہ عالم خان صاحب مولوی سید جلال صاحب مہر۔ مولوی سرور خان صاحب معتزز رکن بلدیہ۔ مولوی رحمت علی خان صاحب۔ مولوی غلام علی خان صاحب کا ممنون ہوں۔ جن حضرات نے قدم قدم پر میری مدد اور رہنمائی فرمائی۔ اور مولوی قادر خان صاحب

صدر انجمن مہدویہ نے مواد کی فراہمی میں جس خلوص و محبت کا اظہار فرمایا وہ میرے لئے موجب ممنونیت ہے۔ ان کے ہمدردانہ رویہ سے میں بے حد متاثر ہوا۔

میرے قابلِ احترام کرم فرما مولوی خلیل اللہ حسینی صاحب صدر کل ہند تعمیر ملت نے باوجود عدیم الفرصتی کے تقریظ قلمبند فرما کر مجھے ممنون فرمایا۔ جناب کبیر خان صاحب کاوش۔ جناب یار علی خان صاحب۔ جناب سردار علی خان صاحب سابق رکن بلدیہ نے مختلف رسائل اور مطلوبہ کتب فراہم کئے۔ اور مولوی سید قاسم صاحب نے کتب خانہ انجمن مہدویہ سے استفادہ کے دوران میری مدد کی جو مطلوبہ مواد سے متعلق تھے۔

جناب ادریس خان صاحب نے بڑے خلوص سے نواب صاحب کی تین نایاب تصویریں عنایت کیں جن میں سے ایک تصویر جو شاہ فاروقی کے فوٹو گرافی کی کھنچی ہوئی ہے شریکِ کتاب ہے۔ نوجوان آرٹسٹ ایم۔ اے۔ غفار صاحب نے بغیر کسی معاوضے کے یہ خوبصورت سرورق بنایا جو زیبِ کتاب ہے۔

مسودات کی تیاری میں میرے بھانجے مرزا ذاکر علی بیگ متعلم چادر گھاٹ ہائی اسکول اور میرے بھتیجے شاہ محمد سعید الدین اور مولوی یوسف علی خان صاحب کے علاوہ جناب سعیدہ بلقیس صاحبہ نے میری بڑی مدد کی۔ اور مولوی عبدالقادر صاحب ٹائپسٹ کی خصوصی دلچسپی و ہمدردی نے میرے کام کو آسان کر دیا۔

آخر میں، میں اپنے استاذ پروفیسر سید محمد صاحب کا ممنون ہوں جنھوں نے بلاک کی تیاری اور طباعت کے کام میں غیر معمولی دلچسپی لی۔

میرے دوست جناب ابراہیم بن عبداللہ صاحب کے تعاون کے بغیر یہ ممکن نہ تھا کہ اس سلسلہ اشاعت کو میں جاری کر سکتا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی انھوں نے میری ہر طرح مدد فرمائی۔ والسلام۔ نذیر الدین احمد میونسپل کونسلر چیلہ پورہ حیدرآباد۔

یہ تصویر شاہ فاروق کے خاص شاہی
مصور نے کھینچی ہے

حضرت بندگیمیاں سید محمود ثانی مہدیؓ

آفتاب ولایت کو طلوع ہوئے تقریباً (۲۰) سال کا عرصہ ہوا ہے۔ کفر اور بدعت کی تاریکی دور ہو رہی ہے اور سنت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی پیروی کے نور نے ہندوستان پر قبضہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ جونپور کے ہر کوچے میں حضرت سید محمد جونپوری (مہدی موعود علیہ السلام) کے وعظ اور خوبی بیان کا چرچا ہے۔ یہاں تک کہ بادشاہ وقت سلطان حسین شرقی بھی کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ حاضر آستانہ نہ ہوتا ہو۔ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت فرما کر ۸۶۶ برس ہوئے ہیں۔ اسی سال سیدنا مہدی موعود علیہ السلام کا عقد آپ کے چچا جناب سید جلال الدین صاحب کی بلند اختر صاحبزادی بی بی الہدادہ رضی اللہ عنہا سے ہوتا ہے ایک یا دو سال کے بعد یعنی ۸۶۷ھ یا ۸۶۹ھ میں وہ محمود مسعود ہستی دنیا میں پیدا ہوتی ہے جس نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے باپ کی اس بشارت کو عملاً پورا کر دکھایا کہ "مجھ میں اور سید محمود میں کچھ فرق نہیں ہے۔ ہاں اتنا ہے کہ بندہ مہدی موعود ہے اور سید محمود مہدی موعود نہیں ہے۔

حضرت سیدنا مہدی موعود علیہ السلام نے جذبے کے ایام ختم ہونے کے بعد سفر حج کا ارادہ فرمایا اور اسی ارادے سے جونپور سے ہجرت فرما کر دانا پور پہنچے۔ جس وقت حضرت کا قیام دانا پور میں تھا ایک روز آرام

فرمانے کے لئے بی بی الہ دادی کے حجرے میں تشریف لے گئے۔ اثناء گفتگو میں بی بی نے عرض کیا کہ بارہا مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوتا ہے کہ ہم نے تیرے شوہر کو مہدی موعود آخر الزماں کر کے پیدا کیا ہے۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ مجھے بھی بارہا ایسے ہی احکام ملے ہیں لیکن چونکہ تاکیدی حکم نہیں ہے اس لئے میں نے ان کو ظاہر نہیں کیا ہے جس وقت یہ الہامی گفتگو حجرے میں ہو رہی تھی حضرت سید محمود جن کی عمر اس وقت (۱۸ یا ۱۹) سال کی تھی۔ حجرے کے باہر کھڑے یہ باتیں سُن رہے تھے ان باتوں کے سننے سے آپ پر جذبہ طاری ہوا اور آپ مست اور جاذب بحق ہو کر گر پڑے حضرت سیدنا مہدی موعود علیہ السلام کو جب اطلاع ہوئی تو آپ حضرت سید محمود کو حجرے میں اٹھا لائے اور بی بی الہ دادی سے فرمایا کہ سید محمود کا بال بال لا الٰہ الا اللہ ہو گیا ہے اور بشارت دی کہ کچھ فیض عنایت ایزدی سے مجھے ملا ہے وہی میرے واسطے سے ان کو ملے گا۔ جب کچھ دیر کے بعد آپ کو ہوش آیا تو آپ نے اپنی والدہ حضرت بی بی الہ دادی کے ساتھ تصدیق مہدی موعود علیہ السلام کا شرف حاصل کیا۔

اس طرح منازل سفر طے کرتے ہوئے حضرت سیدنا مہدی موعود علیہ السلام جب پٹن یا چاپانیر پہنچے تو ایک روز حضرت سید محمود نے حضرت سیدنا مہدی موعود علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ مفلس کے ترک دنیا کرنے اور مالدار کے ترک دنیا کرنے میں کچھ فرق ہو گا۔ حضرت نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ کیوں نہیں جتنی دولت اور مال و متاع چھوڑ کر تارک دنیا ہو گا اتنا ہی اجر زیادہ پائے گا۔ اس وقت حضرت سید محمود نے کسب معاش کے لئے رخصت حاصل کی اور وہیں رہ گئے۔

حضرت سیدنا مہدی موعود علیہ السلام کے مصدقین سے ملک عثمان صاحب

بارڑی ڈال چاپانیر ہی میں رہتے تھے جو سلطان محمود بیگڑھ بادشاہ گجرات کے مشہور امراء سے تھے۔ انھوں نے حضرت سید محمود کے رہنے کے لئے اپنا باغ پیش کیا۔ جب سلطان کو ملک عثمان ہی کے ذریعے آپ کی تشریف آوری کا حال معلوم ہوا تو عمائدین سلطنت سے اعتماد الملک اور عظمت الملک کو آپ کی خدمت میں بھیج کر آپ کو طلب کیا اور چہل ہزاری منصب آپ کے لئے مقرر کرکے بیرم گاؤں اور سابخور جاگیریں عطا کیں۔

روایت ہے کہ حضرت بی بی ملکان حرم محترم حضرت سیدنا مہدی موعود کے ذریعے ایک نوجوان حور طلعت بانو جن کا نام بائی خوب کلاں تھا مشرف بہ تصدیق ہوئی تھیں جو صورت کے لحاظ سے اگر آپ عدیم المثال تھیں تو حسن سیرت کے لحاظ سے آپ ہی آپ نظیر تھیں۔ حضرت سیدنا مہدی موعود نے آپ کا نکاح حضرت سید محمود سے کر دیا۔ آپ کو حضرت سید محمود سے اس قدر محبت تھی کہ اگر سید محمود کو شمع فرض کرلیں تو بائی خوب کلاں کے عشق کو دیکھ کر پروانہ کے دل میں بھی دھواں اٹھنے لگے۔ اگر سید محمود کو گل تصور کرلیا جائے تو ان کی محبت بلبل کو خون رلانے کے لئے کافی تھی۔ حضرت کی ایک لحظہ کی جدائی آپ کے لئے وبال جان ہو جاتی تھی جب حضرت سلطان محمود بیگڑھ کے دربار میں تشریف لیجاتے یا باہر کسی کام کو جاتے تو آپ ان سے وقت واپسی دریافت کر لیا کرتیں اگر گھنٹہ یا ڈیڑھ کی دیر ہوتی تو حضرت کے انتظار میں ایک ایک گھڑی آپ کے لئے ایک ایک صدی کے برابر ہوجاتی اور آپ مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگتیں۔ ایک دفعہ حضرت سید محمود اپنے چند احباب کے ساتھ شکار کو تشریف لے گئے تھے واپسی میں ایک دوست کی جاگیر راستے میں پڑتی تھی انھوں نے آپ کو مجبور کرکے روک لیا اور آپ بادل ناخواستہ ٹھہر گئے ادھر بائی خوب کلاں نے

ساری رات اضطراب و بیقراری میں بسر کی۔ ہر ذرا ذرا سی آواز پر کسی آنے والے کے پاؤں کی چاپ کا دھوکا ہوتا کبھی دالان میں ادھر سے ادھر بیقراری کی حالت میں ٹہلتیں تو کبھی صحن مکان میں۔ آنسوؤں کا نہ رکنے والا سیلاب اس دل کی لگی آگ کو نہ بجھا سکا۔ تارے آپ کی حالت پر آنسو بہا رہے تھے تو چاند سکتے میں آپ کو گھور رہا تھا۔ رات ماتمی سیاہ چادر اوڑھے زبان خاموش سے آپ کی بیقراری اور اضطراب پر ہمدردی کا اظہار کر رہی تھی۔ اس حالت میں تین چوتھائی رات گذری اور آپ نے اپنے بلند مرتبت شوہر کی یاد میں دنیائے فانی سے جاودانی کو کوچ کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ صبح کی بھینی بھینی ہوا نے اپنی گنگناتی ہوئی آواز میں فاتحہ پڑھی اور صبح نے اپنی دارالسلطنت (مشرق) سے سورج کی کرنوں کے ذریعے نور کی طبق روانہ کئے کہ آپ کے بے جان قالب پر نثار کئے جائیں۔

صبح ہو چکی ہے۔ دارالسلطنت گجرات (چاپانیر) میں سب لوگ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں لیکن سید محمود کے مکان میں بی بی خونجلاں کی اچانک موت نے قیامت کا شور برپا کر رکھا ہے۔ حضرت سید محمود شکار سے واپس تشریف لاتے ہیں خدمت گاروں سے معلوم ہوتا ہے کہ بائی خونجلاں نے آپ کی یاد میں داعی حق کو لبیک کہا۔

پروانے کے یاد شمع میں جل کر فنا ہو جانے کی کیفیت سُن کر اس شمع کی کیا حالت ہوئی ہوگی کہ جس نے سوز عشق سے روشن ہو کر پروانے کو جلنا سکھایا تھا لیکن حضرت سید محمود جس کو وراثتاً تسلیم و رضا کی تعلیم ملی تھی۔ جنھوں نے آل رسول کے متروکہ میں حضرت حسین شہید کربلا کے استقلال اور عابد بیمار کے صبر کی دولت حاصل کی تھی۔ راضی بہ رضا

ہو کر خاموش ہو رہے ہیں۔

ایک عرصہ دراز تک آپ کو نکاح ثانی کا خیال تک نہ ہوا اس عرصہ میں آپ چاپانیر میں رہے لیکن انتظام خانہ داری کے بے ترتیبی اور شریعت رسول اللہ علیہ وسلم کی پابندی کے خیال نے مجبور کیا کہ آپ دوسرا نکاح کریں آپ نے اپنے چند احباب سے اس شرط پر یہ خیال ظاہر فرمایا کہ جس سے اب نکاح ہوگا وہ پہلی بیوی سے سیرت اور صورت میں مشابہ ہو۔ جناب ملک عثمان صاحب باڑیوال کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اپنی صاحبزادی کا نام حضرت کی خدمت میں پیش کیا جب آپ سے حضرت کی شرط بیان کی گئی تو آپ نے فرمایا کہ میں کدبانو کو حضرت کی خدمت کے لئے دیتا ہوں۔ بی بی بنانے کی خواہش نہیں ہے۔ غرض بندگی سید محمود کا نکاح بی بی کدبانو سے ہو گیا۔ ملک عثمان باڑیوال نے جو بہت ہی مالدار تھے علاوہ زیور سامان جہیز اور مال و متاع کے کئی خدمت گزار لونڈیاں بھی ساتھ دیں۔ روایت ہے کہ شب زفاف کو حضرت نے سوتے سوتے پانی مانگا بی بی کدبانو پانی لانے دوڑیں لیکن پانی آنے تک آپ سو گئے تھے جب ہوشیار ہوئے تو آپ نے دیکھا بی بی پانی لئے کھڑی ہیں فرمایا کہ کسی لونڈی سے منگوا لیا ہوتا خود لانے کی کیا ضرورت تھی بی بی نے جواب میں عرض کیا کہ مجھے آپ کی لونڈی ہونے کی خواہش نہیں ہے بلکہ میں اپنے آپ کو آپ کی لونڈیوں میں سے ایک سمجھتی ہوں۔ حضرت بندگی سید محمود اور بی بی کدبانو میں اس قدر محبت تھی کہ آج بھی قوم مہدویہ میں اس محبت سے فال لی جاتی ہے۔

حضرت مہدی موعود علیہ السلام کا قیام نگر ٹھٹھہ میں تھا جب

آپ نے حضرت بندگی میاں سید خوندمیر حضرت شاہ نعمت حضرت شاہ عبدالمجید حضرت شیخ محمد کبیر اور میاں یوسف رضوان اللہ علیہم اجمعین کو گجرات جانے کا حکم دیا تو حضرت سید سلام اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت بندگی سید محمود کو خط لکھا کہ یہاں مریدین و معتقدین حضرت مہدی موعود علیہ السلام کے ذریعے ولایت محمدی کے فیض سے مالا مال ہو رہے ہیں اور تم باوجود فرزند ہونے کے اور اعلیٰ لیاقت و قابلیت کے اس سے محروم ہو جو قرین مصلحت نہیں ہے اس خط کو لکھ کر ختم کرنے کے بعد حضرت سید سلام اللہ نے اس کو حضرت مہدی موعود علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرتؑ نے ارشاد فرمایا کہ بجائے اس کے یہ لکھو "جہاں تم ہو وہاں میں ہوں۔ اور جہاں میں ہوں وہاں تم ہو ظاہر دوری کا اعتبار نہ کرو میں تم سے جدا نہیں ہوں" اس خط کا پہنچنا تھا کہ ظاہری دور وبال جان ہو گئی۔ شان و شوکت اور دولت و ثروت سے دل بیزار ہو گیا۔ صبح سے شام تک یہی فکر رہتی تھی کہ کب علائق دنیا سے فرصت ملے گی اور کب خلیفۃ اللہ باپ کا دیدار نصیب ہو گا۔ ایک روز اسی فکر میں آرام فرما رہے تھے کہ خاتمین علیہما السلام کو خواب میں دیکھا کہ دونوں نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ اب تم یہاں سے چلے جاؤ اسی وقت ہوشیار ہوئے اور دیکھا کہ مکان کے صحن میں کھڑے ہیں اسوقت بائی رتنی کے ہاتھ (جو شاید خادمہ تھیں) تلوار اور قرآن منگوایا باپ اور دادا علیہما السلام کے حکم کی تعمیل پر تیار ہو گئے۔ بی بی کد بانو سے فرمایا کہ میں تو اب حضرت مہدی موعود علیہ السلام کی خدمت میں جا رہا ہوں تم والدین کے گھر چلی جاؤ بی بی نے ساتھ چلنے پر رضامندی ظاہر کی اور حضرت کو چھوڑ کر والدین کے گھر

رہنا پسند نہ کیا۔ حضرت نے تمام جائداد و اسباب کو فروخت کر کے ملازمین کی تنخواہیں ادا کیں اور چاپانیر کو خیرباد کہہ کر رادھن پور پہنچے۔ یہاں زادِ راہ ختم ہو گیا اور آپ کو مجبوراً آگے بڑھنے کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ اس زمانہ میں حضرت سید خوندمیر گجرات سے حضرت مہدی کی خدمت میں واپس ہو رہے تھے۔ رادھن پور میں سیدین کی ملاقات ہوئی۔ حضرت بندگی میاں سید خوندمیر کے ساتھ وزر و مال تھا جو سلطان محمود بیگڑھ کی بہن راجے سول نے حضرت مہدی علیہ السلام کی خدمت میں ہدایتاً آپ کے ذریعے روانہ کیا تھا۔ حضرت سید محمود کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے حضرت سید خوند سے کہا کہ اگر تم اس میں سے کچھ بطور قرض کے مجھے دو تو میں بھی حضرت کی خدمت میں چلتا ہوں صدیق ولایت نے یہ کہہ کر "خدا نے آج ہی مجھے اس بارے سبکدوش کر دیا۔ مال مالک کو پہنچ گیا" سب کا سب حضرت ثانی مہدی کے حوالے کر دیا۔ اور عرض کیا کہ یہ بھی کافی نہ ہو تو بندہ کو بیچ کر زادِ راہ کیجئے گا۔ حضرت سید محمود کو حضرت سید خوندمیر صدیق ولایت اللہ عنہٗ کی موجودگی سے سفر میں بڑی سہولت ہوئی تھی جب کبھی منزل قریب آتی حضرت سید خوندمیر آگے بڑھ جاتے اور تمام ضروریات کی چیزیں فراہم رکھتے۔ راستے میں حضرت بندگی شاہ نعمت اللہ رضی اللہ عنہٗ بھی مل گئے۔ ان کے ساتھ بھی بہت کچھ زر و مال تھا جو راجے مرادی (سلطان محمود کی دوسری بہن نے ان کے ذریعے حضرت مہدی موعود علیہ السلام کی خدمت میں ہدیتاً روانہ کیا تھا۔ اس طرح طالبانِ حق کا یہ چھوٹا سا قافلہ مع الخیر خراساں پہنچا۔

حضرت بندگی سید محمود کے فرہ مبارک پہنچنے سے قبل ہی حضرت شیخ محمد کبیر نے حضرت مہدی موعود علیہ السلام کو آپ کی تشریف آوری کی

خبر دیدی تھی ممکن نہیں کہ قلم کی زبان سے اس مسرت کا اظہار ہو سکے جو فرزند ارجمند کی تشریف آوری کی خبر سن کر حضرت مہدی موعود کے دل پر طاری ہوئی تھی۔ حضرت بی بی بون رضی اللہ تعالیٰ عنہا (حرم محترم حضرت مہدی موعود علیہ السلام) نے تعجب سے پوچھا کہ آپ کو فرزند کی تشریف آوری سے اس قدر خوشی کیوں ہو رہی ہے، ارشاد فرمایا "کیوں نہ ہو پوت پوت ہو کر آ رہا ہے اور آنے والوں میں بعض ایسے ہیں کہ جن کی فیض صحبت سے ایک بڑی جماعت مہدی (کامل ہدایت یافتہ) بنے گی"۔ جب آپ سے پوچھا گیا کہ ان کے نام معلوم ہوں تو ہم بھی ان کا ادب کریں۔ ارشاد فرمایا وہ سید محمود اور سید خوندمیر ہیں۔

جب نورانی صورت والوں کا یہ گروہ دائرے کے قریب پہنچا تو حضرت مہدی موعود نے دولت کدہ سے باہر تشریف لا کر ان کا خیر مقدم کیا پہلے سید محمود کو گلے سے لگایا اور پھر حضرت سید خوندمیر اور شاہ نعمت سے ملاقات کی کس قدر پر لطف ہوگی۔ خلیفہ اللہ باپ اور سعادت مند بیٹے کی ملاقات جب وہ سالہا سال کے بعد ایک دوسرے سے ملے ہوں گے۔ جب ان دونوں آفتاب و ماہتاب نے معانقہ کیا ہے تو دونوں کی آنکھوں سے فرط مسرت سے آنسو جاری تھے۔ حضرت سید محمود کے متعلق جو بشارتیں حضرت سیدنا مہدی موعود علیہ السلام نے دی ہیں۔ ان سب کے ایک جگہ جمع کرنے کے لئے ایک خاص دفتر چاہیئے لیکن مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

فرمایا "اگر قیامت کے دن اللہ جل شانہٗ، مجھ سے پوچھے گا کہ ہم نے تجھے ولایت محمدی کا خاتم بنایا تھا تو نے ہمارے لئے کیا نذر لائی ہے تو عرض کروں گا کہ سیدین صالحین (حضرت سید محمود اور حضرت سید خوندمیر رضی اللہ عنہما) کو کامل مسلمان بنا کر لایا ہوں"

میرے اصحاب کی مثال سونار کی بھٹی کی سی ہے جس کے بعض کوئلے پورے سلگے ہوئے ہیں۔ بعض آدھے اور بعض پاؤ۔ بعض سلگنے کے لائق ہوگئے ہیں۔ اور بعض کو صرف بھاپ لگی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ وہ سب سید محمود کے حضور میں سلگ جائیں گے۔"

ایک روز حضرت نے حضرت سید محمود سے فرمایا کہ "تم کو حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں سیر ہے۔"

حضرت سید محمود کے فرہ پہنچنے کے بعد صرف چھ ماہ تک حضرت مہدی موعود علیہ السلام کی حیات رہی۔ اس قلیل مدت میں حضرت سید محمود کی تعلیم کی غرض سے حضرت تمام دن ان ہی کے حجرے میں رہتے تھے۔ روایت ہے کہ سید ین کے واپس آنے کے بعد سے بیان قرآن میں بھی ایک نئی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ حقائق و اسرار پہلے کی بانسبت زیادہ بیان کئے جانے لگے تو بعض اصحاب نے عرض کیا کہ ایسا بیان آج تک نہ ہوا تھا جیسا اب ہو رہا ہے تو ارشاد فرمایا کہ اس کے حامل آگئے ہیں اب موقع نہیں ہے کہ حقائق و اسرار چھپائے جائیں۔

جب حضرت علیہ السلام نے انتقال فرمایا تو تدفین کے وقت حضرت سید محمود قبر میں اترے جب آپ دفن کے بعد قبر سے باہر تشریف لائے تو بالکل حضرت مہدی موعود علیہ السلام کے مشابہ ہو گئے تھے۔ حضرت صدیق ولایت نے دیکھتے ہی فرمایا کہ بھائیو مہدی موعود علیہ السلام ہم سے دور نہیں ہوئے دیکھو سامنے کھڑے ہیں۔ اس وقت سے تمام صحابہ اور مہاجرین نے آپ کو "ثانی مہدی" کے لقب سے پکارنا شروع کیا۔ حضرت علیہ السلام کی وفات کے بعد صحابہ اور مہاجرین میں سے کسی نے بھی حضرت سید محمود کو نہ چھوڑا (بلکہ آپ کی خدمت میں اس طرح حاضر رہے جس طرح حضرت مہدی علیہ السلام کی خدمت

میں حاضر رہتے تھے۔ اس وقت حضرت ثانی مہدی کی عمر ۴۱ یا ۴۲ سال کی تھی آپ نے حضرت کی وفات کے بعد تقریباً ایک سال تک فرہ مبارک ہی میں قیام فرمایا لیکن جب آپ کو حضرت مہدی علیہ السلام سے بشارت ہوئی کہ یہاں ایک ظالم آئے گا تم گجرات چلے جاؤ آپ نے مع صحابہ و مہاجرین کے گجرات کا قصد فرمایا اور موضع بھیلوٹ میں جو رادھن پور سے تین کوس مغرب میں ہے قیام کیا جس وقت حضرت ثانی مہدی گجرات تشریف لائے حضرت صدیق ولایت خاندیس میں قیام فرما تھے۔ حضرت سید محمود کی تشریف آوری کی کیفیت سنی تو فوراً بھیلوٹ تشریف لائے اور وہیں رہنے لگے۔ ایک روز حضرت سید محمود نے فرمایا کہ تمہارے فقیر اور متعلقین تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے تو اپنے دائرہ کو جاؤ تو آپ نے فرمایا کہ آپ سے جدا رہنا گویا حضرت مہدی سے جدا رہنا ہے میں رہنے کے ارادے سے آیا ہوں حضرت سید محمود نے بڑے اصرار سے آپ کو رخصت کیا لیکن سچی محبت کہیں کسی کے تحدید کرنے سے مٹ سکتی ہے چار ہی ماہ کے بعد حضرت صدیق ولایت مع تمام اہل و عیال اور فقرا کے پھر بھیلوٹ تشریف لائے اور حضرت سید محمود کے ساتھ رہنے لگے۔

حضرت سید محمود کا مقصد دین مہدی کو پھیلانا اور دنیا کو اس کی طرف بلانا تھا آپ نے ایک ایک کر کے اکثر جلیل القدر اصحاب مہدی کو اپنے سے علیحدہ کیا اور الگ دائرے بنا کر رہنے کا حکم دیا۔ چنانچہ حضرت صدیق ولایت سے بھی ایک روز آپ نے تنہا ہی میں فرمایا کہ حضرت مہدی علیہ السلام نے قائلوا و قتلوا کا بار تم پر رکھا ہے۔ یہاں رہ کر تم اس کو ادا نہیں کر سکتے۔ اس لئے بہتر ہو گا کہ تم مجھ سے علیحدہ رہو غرض حضرت صدیق ولایت نے

آپ سے جدا ہو کر ایک ہی منزل کے فاصلے پر کھانبیلی میں قیام فرمایا۔ اس طرح حضرت بندگی میاں شاہ نظام حضرت بندگی میاں شاہ نعمت حضرت بندگی میاں شاہ دلاور۔ حضرت بندگی میاں ابوبکر حضرت بندگی میاں الہ داد حمید حضرت بندگی میاں شیخ محمد کبیر حضرت بندگی میاں شاہ عبدالمجید وغیرہ رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے جلیل القدر صحابہ کو بھی آپ نے علیحدہ رہنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا کہ صحابہ کے متفرق رہ کر دعوت الی اللہ کرنے سے دین کو تقویت ہوتی ہے۔ اصحاب مہدی موعود کے علیحدہ علیحدہ رہ کر تبلیغ کرنے سے گجرات میں دین مہدی نے اس قدر ترقی کی کہ ہزارہا کی تعداد میں طبقے کے لوگ تصدیق مہدی سے مشرف ہوتے اور گھر بار چھوڑ کر صحابہ کے ساتھ ہو جاتے تھے چنانچہ اس زمانے میں حضرت صدیق ولایت کے ساتھ نو سو بچاس طالبان خدا تھے اور اس طرح ہر صحابی کے ساتھ چار سو ساڑھے چار سو کی تعداد تھی۔

جب دین مہدی سارے گجرات میں پھیلنے لگا اور لوگ مال و دولت گھر بار چھوڑ کر اس طرف آنے لگے تو علماء گجرات نے چاپانیر (دارالسلطنت) کو عرضیاں بھیجیں کہ سید محمد جونپوری جنہوں نے مہدیت کا دعویٰ کیا تھا خراسان میں انتقال کر چکے ہیں اور ان کے بیٹے سید محمود نے گجرات میں آ کر ہنگامہ مچا رکھا ہے لوگ گمراہ ہو رہے ہیں لہٰذا یہ قید کر دیئے جائیں تاکہ فساد آپ مٹ جائے۔ غرض بادشاہ کے حکم سے ۲۹ ربیع الثانی ۹۱۹ھ یا ۹۲۰ھ کو آپ احمد آباد کے محبس میں قید کر دیئے گئے۔ ۴م روز تک قید میں رکھے گئے۔ اور کامل سوا من کی بیڑیاں آپ کے قدوم مقدس میں ڈال دی گئیں۔ حضرت صدیق ولایت نے بیقرار ہو کر کہلوایا اگر اجازت ہو تو دشمنوں سے لڑ کر اور محبس توڑ کر آپ کو چھڑا لاؤں ارشاد فرمایا ضرورت نہیں۔ خدا تعالیٰ

قادر و توانا ہے جس طرح لایا ہے اسی طرح لے جائے گا۔

اللہ اللہ کیا شان استقلال ہے کہ دشمن تکلیف پہنچا رہے ہیں وزنی بیڑیوں نے چلنا پھرنا مشکل کر رکھا ہے۔ معتقدین ہزار ہا کی تعداد میں سرفروشی کے لئے تیار ہیں لیکن رضائے الٰہی کا اس قدر خیال ہے کہ سب تکلیفیں گوارا ساری مصیبتیں منظور اور جواب میں ارشاد ہوتا ہے کہ جیسا لایا ہے ویسا ہی لے جائیگا۔

حضرت صدیق ولایت نے ادھر سے مایوس ہو کر سلطان محمود کی بہنوں (رانجے سوں اور راجے مرادی) کو اس کی اطلاع کی۔ ان دونوں نے اس خبر کو سنتے ہی فرط رنج وغم سے ڈاڑھیں مار مار کر رونا شروع کیا اور محل میں ایک کہرام مچ گیا۔ سلطان محمود پریشان ہو کر محل میں آیا اور وجہ گریہ دریافت کی۔ انھوں نے کہا کہ "سید جی فاطمہ آل رسول فرزند مہدی موعود قید کی سختی اٹھائیں اور ہم گھر میں آرام سے بیٹھے رہیں۔" بادشاہ نے باہر آکر آپ کی رہائی کے فرمان جاری کر دے اور حضرت سید محمود نے کامل چالیس روز کے بعد ۱۴ یا ۱۵ جمادی الثانی ۹۱۹ھ یا ۹۲۰ھ کو قید سے رہائی پائی۔ بیڑیوں کے وزن سے آپ کے پاؤں میں ناسور پڑ گئے تھے۔ بے حد تکلیف بھی تھی۔ کسی نے درد کی کیفیت پوچھی فرمایا اگر درد کا حال کہوں تو فاعل حقیقی کی شکایت ہوتی ہے اگر نفی کروں تو جھوٹ۔ غرض اس مصیبت اور تکلیف میں آپ نے ڈھائی مہینے بسر کئے اور انہی زخموں اور ناسوروں کی تکلیف سے ۱۴۔ رمضان المبارک ۹۱۹ھ یا ۹۲۰ھ میں داعی حق کو لبیک کہا۔

حضرت شاہ نعمت نے نماز جنازہ پڑھائی اور جگر گوشہ مہدی موعود کو موضع بھیلوٹ کے متصل ہیج تالاب کی پشت پر دفن کیا۔ آج کل روضہ مبارک اطراف وجوانب میں بہاری پیر کے روضہ کے نام سے مشہور ہے

آپ کے انتقال کے بعد آپ کے تمام متعلقین نے بہلوٹ سے روانہ ہوکر رادھن پور میں حضرت شاہ نظام رضی اللہ عنہ کے دائرے میں قیام کیا۔

آپ کو بی بی کدبانو رضی اللہ عنہا سے تین فرزند اور ایک صاحبزادی تھیں۔ پہلے فرزند سید عبدالحی عرف روشن منور رضی اللہ عنہ تھے جن کی ولادت حضرت مہدی موعود علیہ السلام ہی کے زمانے میں ہوچکی تھی۔ دوسرے فرزند حضرت سید احمد تھے جنہوں نے بچپن ہی میں وفات پائی۔ آپ کے تیسرے فرزند حضرت سید یعقوب حسن ولایت رضی اللہ عنہ تھے جن کی جملہ واقعات زندگی انشاءاللہ مشاہیر قوم کے سلسلہ میں آئندہ ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کئے جائیں گے۔

آپ کی صاحبزادی کا اسم مبارک حضرت بی بی خونزا گوہر رضی اللہ عنہا تھا۔ آپ کا پہلا نکاح شاہ عبداللطیف ابن شاہ نظام رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا۔ دوسرا نکاح بی بی کدبانو رضی اللہ عنہا نے اپنے بھانجے سید محمود شاہ صاحب سے کیا۔

المصدق جلد (۱) نمبر (۲) ۱۳۴۲ھ ۱۹۲۳ء
مقام اشاعت حیدرآباد صفر م اکتوبر
اڈیٹر سید محمود
صفحہ نمبر (۲۱ تا ۲۴)

المصدق جلد (۱) نمبر (۳)
صفحہ (۲۰ تا ۲۳) ربیع الاول ۱۳۴۲ھ م نومبر ۱۹۲۳ء

المصدق جلد (۱) نمبر (۴)
صفحہ (۲۳ تا ۲۸) ربیع الثانی ۱۳۴۲ھ م نومبر ۱۹۲۳ء

علامۂ بحر العلوم شمسی

تمہید علماء متقدمین میں ایسی مثالیں اکثر ملتی ہیں کہ انھوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے سے کم درجہ اور کم علم افراد کو شہرت حاصل کرتے دیکھا۔ لیکن باوجود علم و فضل کے ان کے اپنے دل میں کبھی شہرت طلبی کا خیال پیدا نہ ہوا۔ اس بیسویں صدی عیسوی میں جس کو اشتہار بازی و شہرت طلبی کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ ایسی مثال صرف علامۂ بحر العلوم اشرف العلماء مولوی سید اشرف شمسی برد اللہ مضجعہ کی ذات ہی میں مل سکتی تھی۔ ہندوستان کے ان تمام اخبارات و رسایل میں جو گزشتہ ستر سال سے چھپتے اور شائع ہوتے رہے ہیں غالباً مجلۂ مکتبہ وہ پہلا رسالہ ہے جس کو علامۂ مرحوم کے حالات زندگی کلام اور تصانیف کا تذکرہ ملک و قوم کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملا ہے۔

نام۔ نسب۔ بچپن سید اشرف نام تھا۔ ابو الشریف کنیت۔ شمسی تخلص فرماتے تھے۔ والد ماجد کا اسم گرامی سید علی صاحب اور دادا کا نام نامی سید اشرف عرف عالم اچھا میاں صاحب تھا۔ آپ گروہ مہدویہ کے ایک مشہور خاندان سیادت "یداللہی" کے چشم و چراغ تھے ۱۲۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ۹ سال کی عمر تھی کہ والد بزرگوار نے انتقال فرمایا۔ اس کے بعد علامۂ مرحوم نے اپنے بڑے بھائی مولانا سید محمود مرحوم و مغفور کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی۔

تحصیل علوم ذوق علم ورثہ میں ملا تھا۔ ابتدائے تعلیم برادر بزرگوار سے حاصل کی، پھر حضرت مولانا سید نصرت صاحب قبلہ اور مولانا سید داؤد صاحب قبلہ مشائخین مہدویہ سے فارسی کی تکمیل فرمائی۔ فطرت نے ذہن رسا عطا کیا تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں طغرا، ظہوری اور چار عنصر بیدل جیسی کتابیں پڑھ لیں۔

عربی کا شوق ہوا تو آپ کے برادر محترم نے اپنے استاد علامہ عباس علی خان مرحوم کی خدمت میں حاضر کیا۔ شاگرد رشید کی غیر معمولی ذہانت و محنت نے آپ کو استاد علام خاص عنایات و الطاف کا مورد بنا دیا۔ دس سال کی کوشش کے بعد (۲۵) سال کی عمر میں جب علامہ مرحوم فارغ التحصیل ہوئے تو علامہ عباس علی خان مرحوم نے مکہ مسجد کے ایک عظیم الشان جلسہ میں دستار بندی فرمائی۔ اور علامہ مرحوم کو اپنے ساتھیوں میں یہ امتیاز بخشا کہ سند حدیث میں آپ کو بحر العلوم کے خطاب سے مخاطب کیا اور سر مجلس اپنی قبا اُتار کر اپنے ہاتھوں سے علامہ مرحوم کو پہنائی۔

اس دستار بندی و سند حدیث نے علامۂ مرحوم کی تشنگی علم کو بجھا نہیں دیا، اس کے بعد علوم ریاضی کی تکمیل علامہ عبد الصمد خاں صاحب قندھاری سے فرمائی اور زمانہ ملازمت میں حضرت سید اللہ بخش صاحب قبلہ مشائخ مہدویہ سے علم نجوم حاصل کیا۔ مولانا قاری محمد ابراہیم صاحب سے قرات سبعہ کی تحصیل کی اور اپنے برادر بزرگوار سے علم تصوف و سلوک کی تعلیم پائی۔

علامۂ مرحوم کے برادر محترم فن شمشیر زنی اور بنوٹ میں یکتائے روزگار تھے۔ علامۂ مرحوم نے ان سے اس فن کو تمام و کمال حاصل فرمایا تھا اور اپنے زمانہ میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔

علامہ مرحوم کی تحصیل علم طالبانِ علم کے لئے درس عبرت ہے وہ جس خاندان میں پیدا ہوئے تھے وہ متوکل فقراء مہدویہ کا گھرانہ تھا۔ جن کا گھر کل آج بھی بے نظیر ہے۔ جنھوں نے ہمیشہ یومیہ اور وظیفہ کو عار اور جاگیر و منصب کو ننگ سمجھا۔ اور جو ہر وقت "للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ" کی مصداق رہے۔ جن کے مسلک میں ذریعہ معاش کا تعین ناجائز اور اپنے باپ اور بھائی کے سامنے بھی دست سوال دراز کرنا حرام تھا۔ دو دو روز تک کھانے کو کچھ نہ ملتا۔ پھٹے پرانے کپڑے جسم پر ہوتے۔ رات کو چراغ کے لئے تیل نہ ہوتا۔ لیکن شوق علم میں کبھی فرق نہ آتا۔ اگر کبھی ان تکالیف نے ہمت پست بھی کی تو بڑے بھائی کے صبر و عمل نے ہاتھ تھام لیا جن کو دیکھتے تھے کہ تیسرے دن کا فاقہ ہے اور معتقدین سے سکر اسکر اکر ہم کلام ہیں۔ دستار بندی کے جلسہ کے روز حیدرآباد کے چھوٹوں اور بڑوں سے مکہ مسجد بھری ہوئی ہے اور حیدرآباد کا یہ قابل فخر فرزند اس میں بغیر شیروانی و عمامہ کے جلسہ میں شریک ہوتا ہے، جسم پر ایک پھٹا ہوا کرتا ہے اور سر پر عمامہ کی بجائے ایک سستی لپیٹی ہوئی۔ غرض یہ کہ اس حالت گدائی اور ان تکالیف و مصائب کے باوجود حضرت مرحوم نے جن علوم میں کمال حاصل کیا وہ حسب ذیل ہیں:۔ حدیث، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، اصول حدیث، معانی و بیان، صرف و نحو، عروض و قافیہ، ادب عربی و فارسی، منطق و علم کلام، تاریخ و مناظرہ، ہیئت و ہندسہ، فلسفۂ قدیم۔

ذریعہ معاش ۔ ملازمت

حضرت علامہ مرحوم بھی اس تذکرہ کو ناپسند فرماتے تھے اور میں بھی اس کو قلمبند کرتے ہوئے رنج و ملال محسوس کرتا ہوں کیونکہ حضرت علامہ مصنف

فراغت تحصیل کے بعد حصول ملازمت تک اپنے جگر گوشوں اور دل کے ٹکڑوں یعنی تصانیف کو فروخت کرکے قوت لایموت کا سامان حاصل کیا۔ ایک دو مثنویاں اور علوم معقول و منقول میں کئی تصانیف جو ان کے ہمعصروں کے ناموں سے منسوب ہیں اگر اس خانہ خراب تنگ دستی نے ان کو مجبور نہ کیا ہوتا تو آج حضرت علامہ مرحوم کی تصانیف کے ساتھ ان کے نام گنائے جاسکتے۔

ابتدائی ملازمت علاقہ صرفخاص مبارک میں اختیار کی۔ پھر صدر محاسبی سرکار عالی میں کام کرتے رہے۔ اور بالآخر مدرسۂ دارالعلوم میں جو اس زمانہ میں علوم مشرقیہ کا کالج تھا پروفیسر مقرر کئے گئے۔ یہاں علامۂ مرحوم کے ذمہ مولوی فاضل و کامل کی جماعتوں کی تعلیم رہی۔ جب مدرسۂ دارالعلوم کلیۂ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات میں ضم ہوا تو مولانا کی خدمات بھی وہیں منتقل ہوگئیں۔ اور یہاں ملک و اہل ملک کی ناقدر شناسی اور حضرت علامہ کی غیور و خوددار طبیعت نے جو عہدہ داران وقت کی چاپلوسی اور آستانہ بوسی کو کبھی گوارا نہ کرسکتی تھی نہ صرف ان کو مددگار پروفیسر کی جگہ دی بلکہ ایک ایسا مضمون فارسی جدید ان کے سپرد کیا گیا جس میں ان کو اپنے کمالات علمی کے اظہار کا بہت کم موقع تھا اور جو ان کے تلامذہ کے لئے بھی ناقابل التفات چیز نہ تھی۔ لیکن کبھی حضرت علامہ نے اس کی طرف سے بے توجہی نہ فرمائی۔ بلکہ اس دلچسپی اور دلدہی سے پڑھایا کہ ان کے شاگرد ان کو کبھی نہیں بھلا سکتے۔ اسی محنت، فرض شناسی، پابندی وقت اور دلدہی کا نتیجہ تھا کہ بلا درخواست مسلسل پانچ سال تک ان کی توسیع سرکار سے منظور ہوتی رہی اور اپنے انتقال سے صرف تین سال قبل وہ وظیفہ حسن خدمت کے ساتھ ملازمت سے سبکدوش کئے گئے۔

اشاعت علم

حضرت علامہ مرحوم کا مقصد حیات صرف ایک تھا یعنی "اشاعت علم"، اپنی عمر کے (۲۵) سال حصول علم میں صرف کئے تھے باقی (۴۴) سال اس کی اشاعت میں گزارے اور اس فرض کو جو "ورثۃ الانبیاءؑ" کا منصب اولین ہے۔ حیات مستعار کا ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ادا کیا۔ جن جن علوم کی تحصیل کی تھی وہ سب مستحضر تھے۔ ان کو بلا کسی تیاری کے وہ اس طرح پڑھاتے کہ طالب علم سیر ہو جاتا۔ مولانا کا دولت کدہ طالبان علم کا کعبہ تھا اوقات مدرسہ کے سوا ہر وقت طلباء کا مجمع رہتا۔ دن اور رات کے شاید ہی چند گھنٹے مولانا کو آرام ملتا تھا۔ نماز فجر کے بعد ہی درس شروع ہو جاتے۔ جب مدرسہ کا وقت آتا تو کوئی ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لئے جھٹکہ پر سامنے کی جانب بیٹھ جاتا۔ مدرسہ پہنچنے تک راستہ میں درس ہو رہا ہے۔ کالج میں بھی جن فرائض کو انجام دیتے تھے وہ اشاعت علم ہی سے متعلق تھے واپسی میں بھی جھٹکہ میں ایک آدھ طالب علم کا ساتھ ہوتا۔ گھر پہنچتے اور تلامذہ کو منتظر پاتے۔ رات کو گیارہ گیارہ بجے تک اسی میں مصروف۔ مجھے یاد ہے کہ ایک صاحب جن کو کسی اور وقت میں فرصت نہ ہوتی تھی رات کو دو بجے حدیث پڑھنے کے لئے آتے اور مولانا کو مستعد پاتے۔ کبھی آپ نے اپنے پڑھے ہوئے علوم میں سے کسی کے پڑھانے میں تامل نہیں کیا۔ ایک مبتدی میزان و منشعب کے پڑھنے کی خواہش کرتا تو اس کو بھی پڑھا دیتے اور منتہی تلامذہ فصوص الحکم و شمس بازغہ کے درس کی درخواست کرتے تو وہ بھی رد نہ ہوتی۔ حلقۂ درس میں امیر و غریب میں امتیاز نہ تھا۔ نواب کاظم علی خان فرزند نواب شوکت جنگ بہادر نواب سردار علی خان خلف نواب سردار یار جنگ مرحوم اور نواب معین الدین خان خلف۔

صادق جنگ مرحوم کو بھی اسی بوریہ پر بٹھا کر پڑھایا جس پر اُن سے قبل ایک گدائے گوشہ نشین کا فرزند بینوا بیٹھ کر پڑھ چکا تھا۔

سررشتۂ تعلیمات و دیگر دفاتر سرکار عالی میں جو نوعمر حیدرآبادی افاضل علوم شرقیہ میں احصا کیا جائے تو شاید ہی کوئی ایسا نکلے گا جس کو بالواسطہ یا بلا واسطہ حضرت علامۂ مرحوم کے چشمۂ فیض سے سیرابی کا موقع نہ ملا ہو۔ اپنے اور بیگانے کا کبھی خیال نہ کیا۔ سب کو شفقت اور دلچسپی سے تعلیم دی۔

اگر کوئی ذہین و محنتی طالب علم مل جاتا تو ایسے خوش ہوتے جیسے کوئی خزانہ ان کو مل گیا ہے۔ اگر ایک دن کے لئے بھی اس کا سبق ناغہ ہوتا تو دوسرے روز حضرت علامہ کالج سے واپس ہوتے ہوئے اس کے گھر پر موجود ہو جاتے اور مزاج پرسی کے بعد وجہ غیر حاضری دریافت فرماتے۔ پابندی سبق کی نسبت نصیحت کرکے واپس تشریف لاتے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جس نے ایک دفعہ ان سے پڑھ لیا اس نے پھر کوئی دروازہ نہ دیکھا۔

سوائے ملازمت سرکاری اور زمانہ ابتدائی کی دو چار خانگی ملازمتوں کے کسی کو معاوضہ لے کر نہ پڑھایا۔ مجھے چودہ سال تک حضرت کی قدمبوسی کا شرف حاصل رہا ہے۔ حضرت قبلہ مرحوم کو تمنا ہی رہی کہ مجھے مولانا جو درس دیتے تھے اس کے معاوضہ میں کچھ قبول فرمائیں لیکن تنخواہ یا مشاہرہ تو کیا کبھی کوئی تحفہ و ہدیہ تک بھی قبول فرمانا گوارا نہ کیا۔

شاعری | زبان فارسی کے پرگو شاعر تھے۔ طبیعت بہت موزوں پائی تھی۔ ایک ایک نشست میں سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو شعر لکھ دینا بڑی بات نہ تھی تمام اصناف سخن پر قادر تھے۔ لیکن غزل اور

قصیدے زیادہ لکھے ہیں۔ کسی امیر و بادشاہ کی شان میں شعر کہنا ان کی طبع غیور کے خلاف تھا۔ اکثر قصیدے نعت یا منقبت بزرگان دین میں کہے ہیں ابتدائی کلام میں بیدل کا انداز تھا، آخر میں حکیمانہ اور ناصحانہ طریقہ پایا جاتا ہے۔ عربی میں بھی شعر کہتے تھے اور برجستہ کہتے تھے۔ ان کے دواوین میں کئی عربی قصیدے موجود ہیں۔ اُردو میں پانچ دس سے زیادہ شعر نہیں۔

دو تین ضخیم جلدیں علامۂ مرحوم کے کلام سے پُر ہیں اور یہ کلام ہے جو اس بیاض کے سپرد آب ہونے کے کئی سال بعد جس میں دس ہزار ابیات بغیر مرتب ہوا اور جس کو علامۂ مرحوم نے ایک امیر سے شعراء کی تنقیص سُن کر اور یہ دیکھ کر کہ اس زمانہ میں قدر سخن نہیں ہے باولی میں پھینک دیا تھا۔

اگرچہ آپ کا تخلص آپ کے نام سے زیادہ مشہور ہوا مگر شاعری علامۂ مرحوم کا اصلی فن نہیں تھا۔ اس کو انھوں نے محض اوقات فرصت میں دل بہلانے کے لئے اختیار فرمایا تھا۔ اور واقعہ ہے کہ جب وہ اپنے مشاغل علمیہ سے فارغ ہو جاتے یا علیل ہوتے اور کوئی کام نہ کر سکتے تو شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوتے۔ چند قصاید متفرق طور پر اور ایک مختصر مجموعہ انتخاب قصاید شمسی کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

اخلاق وعادات

علامۂ مرحوم میں بہت سی اخلاقی خوبیاں جمع تھیں جس کسی نے آپ سے ایک دفعہ ملاقات کی وہ آپ کا گرویدہ ہو گیا۔ حد درجہ بامروت، خلیق، نرم مزاج اور حلیم تھے خودداری اور غیرت کا یہ عالم کہ کبھی کسی کے سامنے اپنی کسی غرض کے لئے ہاتھ نہ پھیلایا۔ عہدہ داران اور حکام سرکاری کی چاپلوسی و خوشامد کو ہمیشہ عار سمجھا کئے اگر کسی شاگرد نے کوئی خدمت کر دی (مالی خدمت تو کبھی قبول ہی

نہیں کی) تو جب تک اس کے ساتھ علاوہ تعلیم و تدریس کے کوئی اور اچھا سلوک نہ کر دیا آرام نہ لیا۔

حسنِ معاملہ میں بے نظیر تھے۔ اگر کسی کا قرض ہو جاتا تو اس کی ادائی تک کچھ عجیب بیقراری مولانا کو رہتی اور جب ادا کر دیتے تو شکرِ خدا بجا لاتے۔ ایک دفعہ مجھ سے موٹر اجارت پر منگوائی معلوم ہوا، نواب کاظم علی خاں صاحب سے اپنے صاحبزادہ مولوی سید اسد اللہ صاحب کی پہلی شادی کے لئے کچھ قرض لیا تھا اس کی ادائی کے لئے کوہ مولا کو جاناہے جہاں نواب صاحب اس زمانہ میں رہتے تھے۔ میں نے موٹر بھیجی اور ایک عریضہ میں گلہ کیا کہ میرے ہوتے آپ نے اپنی ضرورت پر دوسروں سے قرض حاصل کیا۔ جواب میں تحریر فرمایا مجھے اندیشہ تھا تم روپیہ دیکر واپس نہ لوگے۔ میں جانتا تھا کہ ساڑھے چار سو کی تنخواہ ان کے یہاں بیس روز سے زیادہ کافی نہ ہوتی تھی۔ خرچ تو بچاس پچاس سو ہی کا ہے لیکن خیرات میں سب اُٹھ جاتا ہے۔ اور کبھی قرضہ کی ضرورت پیش آجاتی ہے اس لئے وعدہ کر لیا کہ ایک روپیہ اگر آپ بطور قرض لے کر واپس کر دیں گے تو لے لوں گا۔ اس کے بعد سے کئی دفعہ مجھ سے قرض حاصل کیا مگر کبھی ایسا نہ ہوا کہ تنخواہ یا وظیفہ انھوں نے کالج یا خزانہ سے اٹھایا ہو اور میرا قرض ادا کئے بغیر گھر گئے ہوں۔

سادگی اس بلا کی کہ اچھے کپڑے، اچھے کھانے، اچھے لباس کا کبھی خیال نہ کیا۔ جب میں نے پہلی دفعہ سبق کے لئے حاضر ہونا شروع کیا تھا تو صرف ایک بوریا پر جا اکثر جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ بیٹھ کر درس دیا کرتے تھے جب باہر کے کمرے بن کر تیار ہو گئے تو ان میں ایک دری بچھادی گئی تھی اسی کمرے کے ایک گوشہ میں حضرت مولانا تشریف فرما ہیں۔ سر کے بال بکھرے ہوئے

ہیں۔ قمیص کے بٹن کھلے ہوئے ہیں۔ پاندان ایک طرف رکھا ہے اور دوسری طرف کتابوں کے انبار ایک چھوٹا سا ڈسک جس پر ایک، دوات قلم بھی ہے سامنے رکھا ہے اور حضرت مولانا مصروف درس ہیں۔

مختصر یہ کہ اپنے اخلاق و عادات کے لحاظ سے حضرت مولانا علماء متقدمین کا ایک مکمل نمونہ تھے جس کا اس زمانہ میں پھر نظر آنا دشوار ہے۔

تصانیف

اشاعت علم کے عنوان سے میں نے ان صفحات پر جو کچھ لکھا وہ نامکمل ہے۔ جب تک مولانا مرحوم کی تصانیف کا ذکر نہ کیا جائے۔ صرف درس و تدریس ہی کے ذریعہ حضرت مرحوم نے اشاعت نہیں کی بلکہ اپنے بعد تمام اصنافِ علوم پر تقریباً ڈیڑھ سو تصانیف کا ایک بیش قیمت ذخیرہ چھوڑا۔ جو وقت مدرسہ اور درس و تدریس کے اوقات سے بچ جاتا اس میں تصنیف و تالیف کا شغل رہتا۔ نہ اُن کو دنیا تھی نہ اُن کی تقدیر نے اپنی زندگی میں ان کو اپنی تصانیف کی اشاعت سے شادکام ہونے کا اور موقع دیا۔ چند چھوٹے چھوٹے رسالوں کے سوا سب کتابیں اب تک طبع نہیں ہو سکیں۔ ۲۰ سال کی محنت میں قرآن مجید کی تفسیر عربی زبان میں لکھی جو کئی ضخیم جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ علم نحو میں ایک (۸۰۰) صفحہ کا رسالہ لکھا۔ جو اپنی آپ نظیر ہے اور جس میں ان تمام مسائل نحویہ پر جو علماء متقدمین میں مختلف فیہ رہے ہیں نہایت مبسوط بحث کی ہے۔ منطق، علم کلام، تصوف، قرأت، نجوم، عقاید، اصول حدیث، اصول فقہ اور علم اخلاق میں کئی رسالے تصنیف فرمائے جن کی تفصیل کا یہ مضمون متحمل نہیں ہے۔

میری درخواست پر اپنے آخری ایام حیات میں تفسیر لوامع البیان کا

مقدمہ تحریر فرمانا شروع کیا تھا جس کے ساڑھے پانچ سو صفحات لکھے گئے تھے۔ اور عبادات کا باب شروع ہوا تھا کہ حضرت علامہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور انتقال فرمایا۔ یہ حضرت مرحوم کی آخری تصنیف ہے۔

اہل و عیال

علامہ مرحوم نے اپنی زندگی میں اولاد کے بہت داغ اٹھائے۔ آپ کے دو صاحبزادے اور کئی لڑکیاں ہوئیں۔ بڑے فرزند مولوی سید علی مرحوم جن کو حضرت علامہ نے بڑی محنت سے تعلیم دی تھی اور جنھوں نے نو عمری ہی میں اپنے آپ کو باپ کی جانشینی کے قابل ثابت کر دیا تھا۔ عین اس وقت انتقال کیا جبکہ مولوی فاضل و کامل کے امتحانات میں بدرجۂ اعلیٰ کامیاب اور صاحب تصانیف ہو چکے تھے۔ ان کے تصانیف کے منجملہ "شرح دیوان زہیر" چھپ گئی ہے۔ عربی میں نہایت برجستہ شعر کہتے تھے۔ فارسی اور اردو کلام بھی بہت اچھا تھا۔ یہ داغ کچھ کم نہ تھا کہ مسلسل کئی صاحبزادیوں نے انتقال کیا۔ سب سے بڑی اور نہایت قابل صاحبزادی کا انتقال حضرت علامہ کی وفات سے صرف ۷ ماہ قبل ہوا تھا جنھوں نے کئی چھوٹے چھوٹے بچے اپنے بعد چھوڑے۔ زمانہ مرض الموت میں ایک دفعہ فرمایا۔ میاں جو زخم دل میں تھے وہ بیٹھے ہی نکل آئے ہیں۔

اب صرف ایک صاحبزادہ مولوی سید اسد اللہ ان کی یادگار ہیں اور کلیہ جامعۂ عثمانیہ کی جماعت بی، اے میں زیر تعلیم ہیں۔ خدا ان کو سلامت رکھے اور حضرت علامۂ مرحوم کا سچا جانشین بنائے۔

علماء و کاملین کی صلبی اولاد کے ساتھ ان کی روحانی اولاد بھی قابل ذکر ہے جو ان کے نزدیک اول الذکر سے کچھ کم عزیز نہیں۔ یوں تو حضرت علامہ کے تلامذہ کی تعداد کثیر ہے کہ ان کا گنوانا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے

لیکن قابل ذکر حسب ذیل ہیں :-

(۱) جانشین علامۂ مرحوم جناب مولانا مولوی محمد سعادت اللہ خان صاحب جوش مولوی فاضل و کامل و متکلم اول مددگار پرنسپل مدرسۂ فوقانیہ عثمانیہ دار العلوم سرکار عالی۔

(۲) حضرت مولانا مولوی سید شہاب الدین صاحب قبلہ فرزند حضرت مولانا سید نصرت صاحب قبلہ جو اکابر مشائخین مہدویہ سے ہیں۔

(۳) حضرت مولانا سید عالم صاحب مولوی فاضل و کامل اہل چن پٹن علاقہ میسور۔

(۴) حضرت مولانا سید مرتضیٰ صاحب۔

(۵) حضرت مولانا سید نجم الدین صاحب افضل العلماء

خدا اُن سب کے فیوض کو ہمیشہ جاری رکھے جو درحقیقت حضرت علامہ کے فیوض و برکات علمیہ ہیں۔

وفات اواخر ماہ ذیحجہ میں ۱۳۴۸ھ میں مرض سرطان میں حضرت علامہ مبتلا ہو گئے۔ ابتداء میں یہ مرض پہچانا نہ گیا۔ اور مختلف علاج کئے گئے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ جب سے یہ مرض شروع ہوا تھا حضرت مرحوم کو اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ عشرۂ محرم میں اپنے عقاید کے بموجب ترک دنیا کی اور وظیفہ حسن خدمت سے دست برداری فرمائی۔

جب مرض نے ترقی کی تو پھر میرے مجبور کرنے پر دواخانۂ عثمانیہ میں علاج کروانے پر راضی ہوئے۔ ایک خاص کمرہ لے کر اس میں رکھا گیا اور عمل جراحی ہوا۔ مرض بڑھتا ہی گیا۔ ۲۵ محرم ۱۳۴۹ھ کو مکان واپس لایا گیا اور ۲۶ محرم الحرام ۱۳۴۹ھ روز شنبہ کو صبح طلوع فجر کے وقت ۶۹ سال

کی عمر میں تقدیر الٰہی کو لبیک کہا - انا للہ وانا الیہ راجعون -

اس مرض میں حضرت علامہ کی قوتِ برداشت کے اندازہ کا موقع ملا - ہوشیار ہیں اور پیٹھ زخموں سے بھری ہوئی ہے - ڈاکٹر صاحب سڑے ہوئے گوشت کے ٹکڑے کتر کتر کے علیحدہ کر رہے ہیں لیکن پیشانی پر بل ہے نہ چہرے پر زردی - میں نے جب تسلی کے الفاظ کہے تو ارشاد ہوا کہ ہماری زندگی میں مسرت و آرام کے ایام و مصیبت و تکلیف کے زمانہ میں سو اور دس کی نسبت ہے لیکن انسان کتنا ناشکر گزار ہے کہ دس دن کی مصیبت کے لئے سو دن کے آرام کو بھول جاتا ہے -

غرض حضرت علامہ کئی حیثیتوں سے اپنی آپ نظیر تھے - اب وہ آفتاب علم کہاں جو پچاس برس سے حیدر آباد پر ضیا پاش تھا - وہ دریائے علم کہاں جس نے ہزاروں تشنہ کامان علم کو سیراب کیا تھا - اب چنچل گوڑہ کا وہ شرقی اور سنسان کنارہ جس کی پگڈنڈی کے راستوں پر صبح و شام ہر وقت طالبان علم کتابیں بغل میں دبائے قلم ہاتھ میں لئے سر جھکائے یا ایک دوسرے سے چپکے چپکے گفتگو کرتے ہوئے گزرتے نظر آتے تھے آج ویران پڑا ہے - وہ حجرہ جس کی میلی شطرنجی پر بیٹھنے سے قلب کو نور اور دماغ کو روشنی ملتی تھی شمع علم سے خالی ہے - آہ شمسی آنکھ تمہارے دیکھنے کو کان تمہاری آواز کے سننے کو اور قلب و دماغ تمہارے زبان سے نکلے ہوئے مسائل علمیہ و دینیہ کے سمجھنے کو بیقرار ہیں تم اپنے وقت پہ گئے مگر ہم کو بے وقت چھوڑا - خدا تمہارے درجات بلند کرے - تم کو اپنے دیدار سے سرفراز کرے اور جنتیوں میں تم اسی عزت سے رہو جس عزت سے یہاں تھے -

تم کو زمانہ نے تمہارے بعد یاد کیا ہے لیکن اب بھلا نہیں سکتا۔
تمہاری تصانیف تم کو زندہ رکھیں گی اور تم ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہو گے۔

مجلہ مکتبہ
مدیر عبدالقادر سروری
مقام اشاعت حیدرآباد
جلد (۵) شمارہ (۶)
آبان ۱۳۳۹ ف م ستمبر ۱۹۳۰ء
صفحہ نمبر (۴۱ تا ۵۰)

مہدوی فرقہ کے اصول اور حالات

یہ فرقہ حضرت سید محمدؒ جونپوری (علیہ السلام) کو مہدی موعود آخر الزماں مانتاہے۔ اور اب مہدی آخر الزماں کی بعثت کا منتظر نہیں ہے۔

مسلہ مہدیت کے سوا اس کے تمام عقائد و اعمال اہل سنت والجماعت کے مطابق ہیں۔ سوائے بعض مسائل کے دوسرے تمام امور میں اس فرقہ کے لوگ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی فقہ پر عمل کرتے ہیں۔ مسئلہ مہدیت سے متعلق ان کا یہ اعتقاد ہے کہ بعثت مہدی علیہ السلام احادیث متواتر المعنیٰ سے ثابت ہے۔ اس سے یہ لوگ سید محمد جونپوری (علیہ السلام) کی مہدیت کے منکر کو احادیث متواتر المعنیٰ کا منکر ہونے کا فر سمجھتے ہیں لیکن اس سے وہ کفر مراد نہیں ہے جو کسی کو اسلام سے خارج کردے اس فرقہ کے نزدیک ایمان کے بھی مدارج ہوتے ہیں۔ اور کفر کے بھی مدارج ہیں۔ گویا کہ یہ لوگ کفر دُون کفر کے قایل ہیں۔ اسی سبب سے مہدوی کسی دوسرے مسلمان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔

اور اصحاب طریقت کی طرح اس فرقہ کے نزدیک بھی دارِ دنیا میں سر کی آنکھوں سے دیدار ذاتِ الٰہی ممکن ہے اور اس دیدار کی طلب ہر مہدی پر لازمی ہے چونکہ یہی طلب دیدار خدا اس فرقہ کا مقصد حیات ہے۔ اسی سے اس کی تکمیل کی غرض سے وہ ذکر الٰہی (دوامًا) ترک حب دنیا، توکل، ہجرت از وطن، صحبت صادقان اور عزلت، کو بھی اپنے اوپر فرض

سمجھتے ہیں۔ اس سے مراد رہبانیت نہیں ہے۔ رہبانیت کی نسبت ان کا بھی یہی مذہب ہے کہ لا رہبانیت فی الاسلام

(حضرت سید محمد جونپوری (مہدی موعود آخر الزماں) آپ سادات بنی فاطمہ سے تھے ۸۴۷ ہجری میں ۱۴ جمادی الاول کو دوشنبہ کے دن بمقام جونپور پیدا ہوئے آپ کے والد کا اسم گرامی سید عبداللہ اور خطاب سید خان تھا۔ اپنے عہد کے مشہور عالم بعمل تھے۔ حضرت شیخ دانیال سے علوم متداولہ کی تکمیل و تحصیل کی۔ موافق و مخالف تمام مورخ متفق ہیں کہ سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ فرمایا اور بارہ سال کی عمر میں تمام علوم معقول و منقول سے فراغت حاصل کی اور اسی عمر میں جونپور کے علماء نے آپ کو اسد العلماء کے لقب سے یاد کیا۔ بچپن ہی سے کچھ ایسے حالات و واردات آپ سے ظاہر ہوتے رہے کہ عالم شباب میں کسی کو بھی آپ کے ولی کامل ہونے میں شک نہ تھا۔ مجلس وعظ کی شہرت اطراف و جوانب میں پھیلی ہوئی تھی اور اس قدر ہجوم ہوتا تھا کہ لوگ درختوں اور مکانوں کی چھتوں پر چڑھ جاتے۔ حضرت سلطان حسین شرقی والئ جونپور اکثر اس مجلس میں حاضر رہا کرتا جو گورما کے راجہ دلیت رائے کا باجگزار تھا۔ حضرت نے ایک روز اپنے وعظ میں مومنین کے ساتھ حضرت رب العزت کے وعدہ نصرت کا ذکر فرمایا اور سلطان حسین کو ترغیب جہاد دی۔ اور خود بھی اپنے مریدین و معتقدین کے ساتھ اس جہاد میں شرکت کی۔ راجہ دلیت آپ کے ہاتھ میں قتل ہوا اور جب اس کا قلب سینہ سے کٹ کر گرا تو آپ نے اس پر اس بت کے نقوش کا مشاہدہ فرمایا جس کی وہ پرستش کرتا تھا۔ اسی وقت آپ پر ایک جذبۂ حق طاری ہوا کہ جب باطل کی پرستش اپنے اتنے گہرے نقوش چھوڑ سکتی ہے تو خدا کی مندی میں جلنا کس قدر خوشگوار

ہوسکتا ہے یہ حالت جذب ۱۲ سال تک جاری رہی۔ جن میں سے ابتدائی سات سال ایسے گزرے کہ آپ صرف اذاں کی آواز پر بیدار ہوتے نماز نہایت اہتمام کے ساتھ ادا فرماتے اور پھر مست و مستغرق ہوجاتے۔

۸۸۷ ہجری میں جب کے آپ سے اسی مستی و استغراق کی کیفیت رفع ہوچکی تھی آپ نے دعوئے مہدویت فرمایا۔ اور اسی زمانہ میں جونپور سے ہجرت بھی کی۔ اور کالپی چندیری جاپانیر (جو اس وقت شاہان گجرات کا دارالسلطنت تھا) ساندو (پایۂ تخت سلاطین مالوہ) دولت آباد احمد نگر بیدر گلبرگہ اور بیجاپور ہوتے ہوئے ڈابول سندر پہنچے اور حج بیت اللہ کا قصد فرمایا۔ خانۂ کعبہ میں رکن و مقام کے درمیان استادہ ہوکر اپنے دعوے مہدیت کا اعلان کیا۔ اور وہاں سے واپس آکر پھر گجرات و کاٹھیاواڑ کے علاقہ میں اپنے دعوے کی تبلیغ کی۔ جب آپ سے آپ کے مذہب کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا "مذہب ما کتاب اللہ و اتباع سنت رسول اللہ"

آپ نے کبھی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمیشہ فرماتے " انی عبد اللہ تابع محمدؐ رسول اللہ " میں خدا کا بندہ اور محمدؐ رسول اللہ کا تابع ہوں۔

۹۰۵ ہجری میں بمقام بڑلی آپ نے اپنے دعوی مہدیت کی دوبارہ تجدید و تاکید کی۔ اور اسی سلسلے میں سلاطین گجرات کے نام دعوت نامے لکھے۔ اور اس میں تحریر فرمایا کہ میں خدا کے حکم سے دعوے مہدیت موعود کرتا ہوں۔ اور اپنے اس دعوے پر اتباع کلام اللہ اور پیروی سنت رسول اللہ کو گواہ لاتا ہوں۔ میرے اس دعوے کی تحقیق کرو۔ اور جس طرح چاہتے ہو مجھے آزماؤ اگر یہ ثابت ہوجائے کہ میں جھوٹا اور مفتری ہوں تو مجھے قتل کرو۔ تاکہ خلق خدا

گمراہی سے بچے۔ ورنہ مجھ پر ایمان لاؤ کہ اب میری بعثت ہو چکی ہے۔
"من ابتغی فہو مومن"

آپ نے اس دعوت و تبلیغ کے راستے میں بہت بڑی بڑی صعوبتیں سہیں۔ پچاسوں مقامات سے آپ کا اخراج ہوا۔ کئی کئی روز کی فاقہ کشی رہی۔ لیکن کبھی اپنے دعوے سے منہ نہ موڑا۔ اور اسی طرح گجرات سے سفر کرتے ہوئے پنجاب اور بلوچستان سے ہو کر قندھار پہنچے اور وہاں سے خراسان کا قصد تھا کہ راستہ میں فرہ نامی ایک مقام پر داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ۱۹ ذیقعدہ ۹۱۵ ہجری قندھار و فراہ کے حکام و علماء نے آپ کا پوری طرح امتحان لیا۔ اور آپ کے دعوے کی تصدیق کی۔ آج بھی فراہ میں آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔

ہفتہ وار اخبار منادی
اڈیٹر خواجہ حسن نظامی
سال نامہ بابت ۱۹۳۶ء
صفحہ نمبر ۳۱۵ تا ۳۱۶

عبادت

عبادت کے لغوی معنی بندگی کے ہیں اس سے عبد نکلا جو کہ محاورہ عرب میں غلام کے معنی رکھتا ہے۔ عبادت کے مفہوم کو سمجھنے سے پہلے معبود کے تخیل کی تدریجی ترقیوں کو تاریخی نقطہ نظر سے معلوم کر لینا زیادہ مناسب ہو گا۔

قطع نظر روایات مذہبی کے جس میں سب سے اہم ترین درجہ قرآن مجید کے قصص حسنہ کا ہے اور جس نے پیغمبروں کے آج سے تیرہ سو برس پہلے ختم ہونے والے سلسلہ کا پتہ دیا اور ان کی تعلیمات کو واضح کیا جو خدا کی طرف سے آتے اور اس کی بھٹکی ہوئی مخلوق کو اسی کی طرف بلاتے تھے۔ علماء تاریخ نے معبود کے تخیل کے جو ادوار قائم کئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب انسان تہذیب و تمدن سے ناواقف اور علم و معرفت سے ناآراستہ دنیا کے ان گنت اور لاتعداد وحشی وحشی جانوروں کے درمیان درختوں کے پھل کھانے والے اور ان کی نرم جڑوں کو چبانے والے دوپائے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا اور جب کہ آدم کی آسمانی معلومات کے چشمے خشک ہونے لگے تھے اور ایک خدا کے تخیل کو اس نے بھلا دیا تھا اس وقت دو ہی چیزیں اس کی گردن کو اپنی طرف جھکا سکتی تھیں اور اس کے معبود کا درجہ حاصل کر سکتی تھیں ایک وہ جن سے وہ ڈرتا تھا خوف کھاتا تھا اور ان کی اذیت رسانی سے محفوظ رہنا چاہتا تھا دوسری وہ جن سے اس کی اپنی حیات مستعار میں کچھ تمنائیں وابستہ تھیں جن پر اس کی امیدوں کا سہارا تھا اور

جن سے وہ کامیابی اور کامرانی کی آرزو رکھتا تھا۔ اسی نظریہ نے ایک طرف دہکتے آفتاب کڑکتے بادلوں چمکتی بجلیوں اور ڈستے سانپوں کو اس کا خدا بنا دیا دوسری طرف دودھ دیتی گائے کھیتوں کو سرسبز کرنے والے دریا اور اس کے لئے سایہ اور میوہ فراہم کرنے والے درخت اس کی جبہ سائی کا ٹھکانا بن گئے۔

آدم کی اولاد دنیا کے سارے خاندانوں کی طرح بڑھتے بڑھتے قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہو گئی اور ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کی اجتماعی اصلاح اور باہر کے آنے والے دشمن سے ان کی اجتماعی محافظت کی ذمہ دار ایک ایسی ہستی ہو جس کے احکام کی تعمیل کرتے ہوئے وہ اپنے نظام مدنیت کو قائم کر سکے اور میدان جنگ میں اپنی یگانگت کے شیرازہ کو بکھرنے سے بچائے اس با اقتدار ہستی کا نام کہیں امیر کہیں بادشاہ کہیں راجہ کہیں قیصر ہو گیا۔ حکومت کے لئے دبدبے اور شوکت کی ضرورت تھی وہ رعایا کی عقیدت نے تاج و تخت فوج و لشکر خیمہ و خرگاہ کے ذریعہ فراہم کر دی۔ اس تخیل نے ترقی کی اور آدم کی بھٹکی ہوئی اولاد نے پھر ایک دفعہ اس علت کاملہ کا تصور کرنا شروع کیا جو ان سارے اقوام و ملل کی روزی رسان تھی جس کے ہاتھ میں ان سب کا تدبر امور نہاں تھا اور جس کے ارادے ان سب کی قسمتوں کو بڑھا اور گھٹا دیتے تھے اس کا نام کسی کی زبان میں یزداں و خدا ہو گیا کسی کی زبان میں اللہ و رحمٰن کوئی پرمیشور اور پرماتما کے گن گانے لگا اور کسی نے گاؤ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر گردن جھکا دی چونکہ یہ تخیل الہامی تعلیمات سے ہٹ کر ناقص عقل انسانی کی پیداوار تھا اس لئے جسم و مادہ سے بالاتر خدائے پاک اور غرض و جوہر سے منزہ پروردگار کے لوازمات میں بھی تخت و تاج اور چتر شاہی شامل کر دیئے گئے ان کے ناقص تخیل میں اللہ ایک سب سے بڑا بادشاہ جس طرح نمایاں ہو سکتا تھا اس طرح خدا کی تصویریں کہیں پہاڑوں کو کھود کر کہیں پتھر و لک

تراش کر کہیں لکڑی کو چھیل کر بنائی گئیں۔ اس کی قدرت کے اظہار کے لئے کمزور انسان کے دو ہاتھوں کی بجائے دس ہاتھ اس کی شانوں سے وابستہ کر دیئے گئے۔ اور اس کے تدبر اور فراست کو اس کے سروں کی تعداد کی زیادتی میں پنہاں سمجھا گیا۔ جب عقلوں نے زیادہ ترقی اور دماغ انسانی زیادہ تہذیب یافتہ ہو گیا۔ تو خدا کا تخیل کچھ اور آگے بڑھا اور برہما، وشنو اور شیو نے جنم لیا سمجھا گیا کہ تین خدا ہیں ایک کائنات ارضی و سماوی کو پیدا کرتا ہے دوسرا اس کو ایک نظام معین کے تحت قائم و برقرار رکھنے کا ذمہ دار ہے اور تیسرا اپنی حیات مستعار ختم کرنے والی ہستیوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے کی خدمت پر مامور ہے کہیں اس تخیل نے بجائے تین کے دو کی تعداد میں یزداں واہرمن کی شکل اختیار کی ایک بھلائی کی طرف بلانے والا اور دوسرا برائی کی طرف لے جانے والا اور ان کے نزدیک ان ہی دو خداؤں کی کشمکش کا نام موجودہ حیات ارضی ہے۔

روح اللہ کی اُمت گمراہ نے رب کو اب سمجھا اور تین خدا بنا دیئے باپ بیٹا اور روح القدس باپ اور بیٹا تو ظاہر ہے روح القدس کے متعلق مسیحی فرقوں میں اب تک اختلاف چلا آتا ہے۔

اب وہ وقت آگیا تھا کہ غفلت اور گمراہی کے سارے پردے چاک کر دیئے جائیں اندھی اور کمزور انسانی آنکھوں میں خدا کے آخری پیغام کی سلائی پھیر دی جائے اور پوجے جانے کے قابل ایک اپنے سب سے آخری رسول کے ذریعہ شرک کے سارے مندروں کو توڑ کر اس طرح صاف صاف سامنے آجائے کہ نہ صفات کے تعین میں اعضاء انسانی کے اضافوں کی ضرورت ہو اور نہ قبل خیرہ و شرہ کے لئے دو متضاد طاقتوں کی طرف رجوع کرنا پڑے نہ خالق کے سوائے محی و ممیت جدا جدا پیدا کئے جائیں نہ

یونانیوں کی طرح ہر صفت کے لئے ایک علیحدہ بت تراشا جائے۔ اب بتادیا
گیا اور جتادیا گیا کہ ایک ہی طاقت ہے جو پیدا بھی کرتی ہے اور سنوارتی بھی ہے
قائم بھی رکھتی ہے اور فنا بھی کر دیتی ہے انسانوں کی آنکھوں جیسی آنکھوں کے
بغیر قلوب کی گہرائیوں میں دیکھتی بھی ہے اور انسانی کانوں جیسے کانوں کے بغیر
نفس کی آواز بھی سنتی ہے جس کو نہ دس سر ہیں نہ پچاس ہاتھ اور جس کے لئے
صرف ایک جملہ کہکر قرآن نے سارے مشرکین کی زبانوں پر مہر لگادی لیس
کمثلہ شئ عدالت و کوتوالی کے موجودہ ترقی یافتہ نظام اعضاء جوارح انسانی
کے اعتدال و اصلاح کا کام کرسکتے ہیں کوتوال کا کوڑا اور سپہ سالار کی تلوار انسان
کے ظاہر کو پاکیزہ بنا سکتی ہے وہ جس کی موجودگی کا خیال جس کی ہر وقت دیکھنے
والی آنکھوں کا تصور جس کے ہر وقت اور ہر آواز کو سننے والے کانوں کا یقین
ایک بھٹکے ہوئے قلب کی رات کی تاریکیوں میں تنہائی کے لمحوں میں مشید
قلعوں کے درمیان گناہوں سے حفاظت اور سیدھے راستے کی طرف رہبری
کرسکتا ہے وہ صرف ایک خدا کا تخیل ہے اس کے سامنے اپنے سارے ارادوں
کو ہیچ اپنی ساری قوتوں کو ناچیز اپنی ساری کاوشوں کو بے اثر سمجھ کر اپنی گردن
طاعت کو خم کر دینے اور اس کی مرضی میں اپنی مرضی کو شامل کر دینے کا نام عبادت ہے۔

ہم نے اب تک خدا کے تدریجی تخیل کی کیفیت بیان کی اب یہ امر ملحوظ
رکھنے کے قابل ہے کہ دنیا نے ابتداء آفرینش سے چھٹی صدی عیسوی تک خدا
کی عبادت کن کن طریقوں سے کی اور فاران کی چوٹیوں سے دس ہزار قدوسیوں
کے ساتھ اترنے والے نے عباد اللہ کے تخاطب کے ساتھ عبادت کا کیا طریقہ
دنیا کے سامنے پیش کیا زمانہ ما قبل تاریخ میں جب کہ انسان ایک ناتراشیدہ
پتھر کی طرح تھا۔ اور سوائے درختوں کے پھل اور جنگلوں کے جانوروں کے

خدا کی پیدا کی ہوئی اَن گنت اشیاء کا علم اور ان کی تسخیر کے ذرائع پر واقف نہ ہو سکے تھے اس کی عبادت کا ایک اور صرف ایک طریقہ تھا وہ یہ کہ اپنی متاع دنیا کے محبوب ترین حصہ کو خدا کی راہ میں قربان کر دے سونے اور چاندی کی دریافت نہ ہوئی تھی ہیرے اور یاقوت کی کانوں کو پہاڑوں کے دامن چھپائے ہوئے تھے برق کی قوت عقل انسانی کی ترقی کا انتظار کر رہی تھی حرفت و صنعت کے جوہر دست و بازوئے انسان میں پوشیدہ تھے زراعت کا فن آب و گل سے باہر ابھی نہ آسکا تھا اور اس وقت انسان کی سب سے بڑی کائنات وہ جانور تھے جن پر اس نے قبضہ کر لیا تھا سال کے مقررہ دنوں میں وہی جانور پکڑ کر لائے جاتے اور خلوص دل سے اس بارگاہ پر نذر چڑھا دیئے جاتے جو خدا کی حیثیت میں ان کے قلب و دماغ کی رونق بن رہی تھی جب بادشاہت کے تخیل نے خدا میں لوازم شاہی کی ضرورت محسوس کروائی تو اس کے بت تاج و تخت سے سنوارے گئے ان کے سامنے صندل اور عود کے دھوئیں دیئے گئے اُن کے چہرے کو گل اور زعفران سے رنگے گئے ان کے قدموں کو عرق گلاب سے دھویا گیا اُن کی قیام گاہ پر فلک بوس عمارتیں بنائی گئیں ان کے دروازوں پر ناقوس و جرس آویزاں کئے گئے ان کے گرد جگر کاٹ کاٹ کر ان کی خوشنودی کے حصول کی کوشش کی گئی اُن کی شکل کو آنکھوں میں بٹھا کر یکسوئی کا ذریعہ بنایا گیا مصیبتوں میں اُن کی پناہ مانگی گئی اور خوشنودی میں ان پر چڑھاوے چڑھائے گئے بالآخر وہ وقت آگیا کہ ظاہری بادشاہ اور حقیقی بادشاہ کے مراتب کا فرق ظاہر کر دیا جائے انسان کی پیدائش اور حیات مستعار کے راز کا پردہ فاش کر دیا جائے اور اس پر واضح کر دیا جائے کہ خدا کی عبادت کو فائدہ پہنچانے اور خدا کو بڑائی دینے کے لئے نہیں ہے بلکہ خدا کی عبادت میں انسان کے

اپنے مقصد زندگی کی تکمیل اس کی اپنی اصلاح و سنوار اور کائنات ارضی میں امن و امان کے قیام کا راز پوشیدہ ہے یہ ظاہر ہے کہ کن کے اشارے سے آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا مجبور محض انسان کی کسی عبادت سے اپنی کسی قوت و طاقت میں اضافہ نہیں کر لیتا وہ جو معلم الملکوت کی فرشتوں کی ہزار در ہزار افواج سمیت صد ہزار سالہ عبادت سے بے نیاز ہے اس آب و گل سے مرکب پیشانی کی گناہ آلود رگڑوں کا محتاج نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جو آخری تخیل دنیا کے ذہن میں پیدا کیا وہ انسان اور صرف انسان کی فلاح و بہبود پر مبنی تھا اور خدا کا ایمان و یقین عمل صالح کی بنیادوں کو بنیان مرصوص بنا لینے کے لئے مجھ سے اگر پوچھئے تو اسلام عبادت کی تعریف صرف ایک لفظی جملے میں کی جا سکتی ہے یعنے (حق کا ادا کرنا) حق کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک حقوق اللہ۔ دوسرا حقوق العباد) اللہ قلب و روح انسانی کی سرسبزی کے لئے تھا تو حق العباد اس عالم کون و فساد امن کے لئے اللہ کے حقوق کی ادائی کیا تھی اس کو اپنی زندگی کے ایک لمحہ میں جاری و ساری سمجھنا اور یقین رکھنا اس کی بے مثال آنکھوں کو ہر وقت دیکھتا ہوا محسوس کرنا اور اس کے بے مثال کانوں کو دنیا میں پیدا ہونے والی ہر آواز کا سننے والا جاننا والا اس ایمان و ایقان کے ذریعہ اس کے پیدا کئے ہوئے خیر و شر کی حقیقتوں کا پہچاننا ایک پر عمل کرنا اور دوسرے سے محفوظ رہنا۔

نماز عالم ارض ذریات شیطان سے معمور تھا قدم انسانی کمزور اور طوفان فسق و فجور کے جھونکے ہمت شکن تھے ہر وقت ایمان کی کشتی کے غرق الحاد ہو جانے کا اندیشہ لگا ہوا تھا نفس و شیطان کی ترغیبوں سے خلوت و جلوت میں محفوظ رہنے کا ایک اور صرف ایک طریقہ تھا۔ ایمان باللہ زندگی میں صرف ایک مرتبہ زبان کا اقرار اور قلب کی تصدیق صلاحیت عمل کی

بنیاد نہ بن سکتی تھی جو ایمان باللہ کا نتیجہ اور اس کا منشاء حقیقی ہے۔ اس لئے ضرورت سمجھی گئی کہ دن کے پانچ مختلف اوقات میں انسان کو ظاہری پاکی سے آراستہ کر کے خدائے قیوم و قدوس کی بارگاہ میں حاضر کر دیا جائے اور نہال ایمان خداوندی کی آبیاری کی جائے تاکہ وان لم تکن تراہ فانہ کا یقین ایک طرف اس کو فحشا و منکر سے محفوظ رکھے اور دوسری طرف جماعت کی پابندی کا خیال سیاست مدن کی بنیاد بن جائے۔

روزہ نفس سرکش خدا کے بعد سب سے بڑی طاقت تھی اسی کے مطیع و منقاد کرنے پر روح و قلب انسانی کی آبادی کا دارو مدار تھا اس کی قوتیں شکم انسانی کی پرورش یا اس کے اعتدال پر منحصر تھیں۔ یہ اپنا حال تھا لیکن دنیا صرف اپنی ذات کا نام نہ تھا ہمیشہ مرغن غذا سے شکم سیر رہنے والے نا ممکن تھا کہ ایک مفلس فاقہ کش کی تکالیف گرسنگی کا اس وقت تک صحیح اندازہ کر سکتے جب تک خود ان کو بھوک اور پیاس کے صدمہ میں مبتلا کر کے لذت اندوز جراحت نہ کر دیا جاتا۔ ضرورت سمجھی گئی کہ سال کے بارہ مہینوں میں سے ایک کو اس نفس کی سرکشی کے لئے مخصوص کر لیا جائے دن بھر کی بھوک پیاس اور شہوات نفسانی بندش سے اس کے پاؤں میں مضبوط بیڑیاں ڈال دی جائیں اور اولاد آدم پر دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جائیں۔

زکوٰۃ نفس سرکش کی ساری طاغونیت کا دارو مدار انسان کی فارغ البالی اور دولت پر تھا۔ انسان دولت کے حاصل کر لینے کے بعد کبھی خدا کا انکار کرنے لگتا تھا اور کبھی خود خدا بن بیٹھتا تھا۔ ورنہ دوسروں کی تکلیفوں کو بھلا دینا اور ان کے عدم احساس سے اپنے قلب و روح کو مفلوج کر لینا دولت کا ادنی کرشمہ تھا اس کی تہہ رکتی تھی اور اپنے پانی کو گدلا کر دیتی تھی اسی

میں جراثیم پیدا ہوتے تھے اور فسق و فجور کے متعدی امراض کو عالمگیر کر دیتے تھے ضرورت سمجھی گئی کہ اس پانی سے چھوٹے چھوٹے نالے نکال کر افلاس کی دھوپ میں جلتے ہوئے درختوں کی جڑوں تک پہنچا دیئے جائیں۔ دولت ایک انسان کے ہاتھ سے نکل رہی تھی۔ اور دوسرے انسان کی جیبوں میں جا رہی تھی خدا کا آسمان وہاں سے بہت دور اور اس کی ذات اقدس اس سے بھی زیادہ اعلیٰ تھی مقصد ایمان کی ترقی اور نسل انسان کی فلاح تھا لیکن نام حق اللہ یا عبادت۔

حج انسان فطرتاً مدنیت پسند پیدا ہوا تھا۔ حیات اجتماعی میں اس کی زندگی کا راز پوشیدہ تھا اور مرکزیت اس زندگی کی روح تھی ضروریات انسانی کی تکمیل کے لئے افکار و اذہان کا یکجا ہونا اور فلاح و صلاح امت کے طریقوں کا معین کرنا لازمی تھا پیش بندیوں سے کام لیا گیا یا ملک کے بت شکن کو چار ہزار سال پہلے وادی غیر ذی زرع کی طرف رہبری کی گئی باپ کے خنجر کے نیچے بیٹے کی گردن کو رکھ کر دنیا کی عظیم الشان قربانی کا نمونہ ایمان کامل کی نظیر اور ایقان صادق کی مثال قائم کی گئی ابراہیم کی زبان سے اپنی زبانی دعوت کہلوائی اور قیامت تک لبیک کہنے والوں کو اجتماعیت کاملہ کا درس آخری محمد امی کے ذریعہ پہنچایا گیا عرف عام میں اس اجتماع کا نام حج اور ہماری اصطلاح میں اس کی تعریف عبادت ہے۔

دنیوی بزرگیوں کی انتہا ملازمت دربانی مصاحبت و تقرب سے آگے بڑھ کر کسی دنیوی بادشاہت زبان و قلم کو اپنا کر لینے میں ہے آسمانی بادشاہت بھی مدارج رکھتی تھی اور انسان کی بلند ہمت کو مخلوقات کی حقیقت ہی کے معلوم کرنے تک محدود نہ رہنے دینا چاہتی تھی ضرورت تھی وہ ایک بالشت آگے بڑھ کر کسی کو ایک ہاتھ اپنی طرف کھینچتی اور ایک قدم آگے بڑھ کر

کسی کو دس قدم اپنی طرف بلاتا یہاں تک کہ اس کی آنکھ بن جاتا اور اس سے دیکھتا اور اس کا ہاتھ بن جاتا اور اس سے کام کرتا گفتن کے دائرہ سے آگے نکلنا دیدن کے حدود کو توڑ دیتا اور شدن کے تحت پر جلوہ افروز ہو جاتا اس کے لئے سب سے طلب دیدار کی ضرورت تھی پھر ذکر کثیر کی۔

(دنیا) کی محبت کو چھوڑ کر ایک کا ہو جانا لازمی تھا۔ ہجرت و عزلت۔ توکل و صحبت صادقان اس راہ کی اہم منزلیں تھیں جس کو قرآن حکیم نے پہلے ہی عاشقان خدا پر لازمی کر دیا تھا نمونہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب کرام کی حیات طیبہ تھی لیکن جس کی فرضیت خلیفۃ اللہ المہدی کے دست پردہ کشا نے ظاہر کی اور بندہ اور خدا کے درمیان راستہ کو کم سے کم تر کر دیا اور "نحن اقرب من الورید" کی تفسیر فرمادی یہ حقوق اللہ تھے اور عبادت کی ایک شاخ۔ اس کی دوسری ڈالی حقوق العباد تھی جس میں کبھی ہمدردی اور ایثار کی کونپلیں پھوٹتی تھیں۔ کبھی رحم و تلطف کی پتیاں نکلتی تھیں کبھی خوش گفتاری اور حسن خلق کے پھول کھلتے تھے اور کبھی مودت و اخوت کے پھل کام و دہن انسانی کی دعوت دیتے تھے حلال کی کمائی کھا کر دوسرے کے ملک پر ناجائز دست اندازی نہ کرنا عبادت ازدواج کے رشتوں کو جوڑ کر خدا کی بندگی کرنے والوں میں اضافہ کرنا عبادت حسن معاشرت سے اپنے گھر کو فردوس بریں بنا لینا عبادت حسن سلوک سے اپنے محلہ کو محبت کا گلستان بنا دینا عبادت دین و ملت کے راستہ میں اپنی عزیز سے عزیز متاع کو خرچ کر دینا عبادت کمزور کا بوجھ اُٹھانا عبادت زور دار کے سامنے گردن جھکانے سے پہلے سب سے قوی و قادر خدا کی ذات پر یقین کر کے اپنے ضمیر کو مجروح نہ کرنا۔ عبادت اس کے بالمقابل نفاق و شقاق سے خدا کی

بستی ہوئی دنیا میں فتنہ و فساد کے طوفان اٹھانا گناہ خدا کی عزیز مخلوق کا قطرہ خون بھی ناحق بہانا گناہ کم تولنا گناہ جھوٹ بولنا گناہ۔ دوسرے کے مال وعزت پر نگاہ بد ڈالنا گناہ۔ ہمسایہ کو ستانا گناہ۔ اپنی حلال کی روزی کو حرام سے مخلوط کر دینا گناہ۔ اور وہ سب کچھ گناہ جس میں نسل انسانی کا دینی و دنیوی خسارہ پوشیدہ ہے۔

اے اللہ کی عبادت کرنے والو۔ لیکن ہر کام میں اپنے نفع کی فکر رکھنے والو۔ خدائے بے نیاز تمہاری عبادتوں کا محتاج نہیں ہے اگر اس کے لئے اپنے قلوب کو نور ایمان سے منور نہیں کر سکتے ہو اور اپنی زندگی کو عمل صالح سے نہیں سنوار سکتے ہو تو اٹھو تمہاری خود پسندی ہی کے تقاضے سے اور کم از کم اسی خیال سے کہ ایمان و عمل صالح خدا کے لئے نہیں تمہاری ذات کے لئے ہے عباد اللہ صادق بن جاؤ اور عبادۃ اللہ کے غلغلہ سے فضائے ارضی و سماوی کے ہر کونے کو معمور کر دو فقط

المصدق (ماہ نامہ)
اڈیٹر سید محمود ید اللہی
مقام اشاعت حیدرآباد جلد نمبر (۲)
بابتہ ماہ صفر ۱۳۵۱ ہجری م
صفحہ نمبر (۱۵ تا ۲۱)۔

اِصلاح مِلّت

دنیا میں کونسی قوم ہے جو اپنی اصلاح نہیں چاہتی۔ اسی جذبہ اصلاح و ترقی کا نتیجہ ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں ہر قوم و ملت میں چند ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی قوم کے اسباب تنزل کا جائزہ لیا اور ترقی و اصلاح کے اسباب سوچے۔ ہر قوم کی ترقی کے اسباب و وسایل اسی طرح مختلف ہیں جس طرح اس قوم کا طریقہ فکر اور مقاصد حیات۔ اسلام نے ایک ایسا طریقہ فکر اپنے پیروؤں کے لئے پیش کیا جو اگر پیدا ہو جائے تو زندگی کی ہر ضرورت اور اجتماعی و انفرادی حیات، ہر مطالبہ کی تکمیل کے لئے کافی ہے۔ اسلام کے نزدیک سب سے بنیادی اور اصولی چیز یہ ہے کہ انسان اس حیات مستعار میں اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے پیدا کرنے والے کے لئے زندہ رہے۔ اپنی زندگی کو اس کے منشاء کی تکمیل اور اپنے مرنے کو اس کی رضاء میں فنا ہونا تصور کرے۔ جب کوئی قوم اس طریقے سے سوچنے اور اس زاویہ نگاہ سے دیکھنے لگتی ہے تو اس کا ضابطہ حیات خدا کے مرتب کردہ ضابطہ کے سوا کچھ اور باقی نہیں رہتا۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں انسانی کی حرکت انفرادی ہو کہ اجتماعی خانگی ہو کہ سماجی عبادت بن جاتی ہے وہ کماتا ہے تو اس لئے کہ خدا نے اس کو جائز طور پر کمانے کی اجازت دی اور خرچ کرتا ہے تو اس طریقے سے جو خدا نے اس کی دولت کے لئے مقرر کر دیا۔ جب اس کی ہر حرکت رضامندی الٰہی کے لئے

ہونے لگتی ہے اور اس کا ہر سکوت پسندیدگی مولیٰ کی خاطر ہوتا ہے تو اس کی زندگی کا ہر شعبہ خود بخود اصلاح پذیر ہونے لگتا ہے۔ قرن اول کی ساری تاریخ اس ایک نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ داعی اسلام کے مخاطبین اول کا طریقہ فکر بدلا تو مزاج بھی بدلا اور مزاج بھی بدلا تو راہ عمل بدلی اور راہ عمل بدلی تو زندگی کی کایا پلٹ ہو گئی۔ وہ قومیں جن کو محفل اقوام عالم میں کوئی جگہ نصیب نہ تھی صدر نشین بزم کائنات بن گئیں وہ افراد جن کی زندگیاں انسانیت بلکہ بہیمیت کا بدترین نمونہ تھیں فرشتوں کے لئے باعث رشک ہونے لگیں جن کو پینے کے لئے اونٹ کا دودھ بھی پوری طرح میسر نہ آتا تھا وہ خدا کی پیدا کی ہوئی الوان نعمت سے متمتع ہوئے جن کو جسم پر کپڑا لپیٹنے کا سلیقہ نہ تھا انھوں نے دنیا کی عریانی کو مٹایا اور ستر پوشی کی جن کی غلامی تقدیر ملت بن گئی تھی وہ دنیا کے غلاموں کو درس آزادی دینے لگے جو شاعری کے سوا کوئی علم نہ جانتے تھے وہ حکمائے یونان اور فلاسفہ ہند کے لئے باعث رشک بن گئے اور اسی طریقۂ فکر کو چھوڑنے کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمان پھر انحطاط اور پستی کے اس دور تک پہنچ رہا ہے جہاں سے خدا کا آخری پیغام لانے والے نے اس کو اٹھایا۔ آج ہماری زندگیاں یا تو اپنے نفس کے لئے بسر ہوتی ہیں یا اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی خوشنودی کی خاطر ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں لیکن ہمارے قلب و دماغ اسلامی فکر سے خالی ہیں ہمارے سامنے سب کچھ ہے مگر خدا نہیں۔ ہم سجدے بھی کر رہے ہیں ہم وظیفہ پڑھ رہے ہیں ہم روزے بھی رکھ رہے ہیں جن کو خدا نے طاقت دی ہے وہ زکوٰۃ بھی دے رہے ہیں اور حج بھی کر رہے ہیں لیکن کتنے ہیں جن کی نماز معراج المومنین بن رہی ہو جن کے روزے اپنے اجر میں ذات خدا کو حاصل کر رہے ہوں جن کی زکوٰۃ

نجارۃ لن تبور ثابت ہو رہی ہو اور جن کا حج خلیل و ذبیح کے منشاء حیات کو پورا کر رہا ہو۔ وجہ ایک اور صرف ایک کہ اس سارے عمل میں وہ روح نہیں جو اصحاب رسول کے عمل میں پائی جاتی تھی۔ خدا ہماری عبادتوں کا بھوکا نہ تھا۔ فرشتوں اور کروبیوں کی عبادت نے اس کی خدائی میں کوئی اضافہ کیا تھا نہ ہماری روگردانی اس کی خدائی کے لئے باعث نقص ہوتی یہ عبادتیں تو اس لئے تھیں کہ ان کے ذریعہ ہمارا یہ نقطۂ فکر وسیع تر ہوتا جائے اور ہماری حیات دنیا کے تمام جہات و اسماتن میں ہم کو خدا ہی کا نور نظر آنے لگے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعائے صبحگاہی کیا اسلامی نقطۂ فکر کی صحیح ترجمانی نہیں کر رہی ہے، کہ اے خدا میرے دل کو میری زبان کو میری سمع کو میری بصر کو اپنے نور سے معمور کر دے میرے آگے اپنا نور عطا فرما میرے پیچھے اپنا نور عطا فرما میرے روبرو اپنے نور سے چھا جا اور میری حیات کے ہر گوشہ کو اپنے نور سے معمور کر دے۔

وقت ہاتھ سے نہیں گیا۔ ابھی سورج کی آخری کرنیں نظر آ رہی ہیں۔ دل کے گوشوں کو تاریکی نے پوری طرح مغلوب نہیں کیا۔ صبح کے بھولے کے لئے گھر آنے کا وقت باقی ہے۔ اخلاقی و علمی و معاشی و معاشرتی اصلاح چاہتے والو تمہاری ترقیاں تا بہ اوج ثریا پہنچ کر بھی تنزل ہیں اگر ان میں فکر اسلامی نہیں ہے۔ وہ مبارک مہینہ آ رہا ہے جس کا ایک ایک لمحہ انوار الٰہی کی موجوں سے معمور ہے۔ جس کی ابتداء اور جس کی انتہائی دونوں مبارک ہیں جس میں شیطان نفس پابہ زنجیر ہو جاتا ہے۔ کیا وقت نہیں آ گیا کہ اس مہینہ کو صرف فکر اسلامی پیدا کرنے کی کوشش میں بسر کر دو۔ نمازوں سے اپنے دل کے تخت پر رب العرش کو جلوہ افروز کر دو۔ سجدوں سے اپنی پیشانیوں کو رشک صد آفتاب بناؤ۔ روزوں سے اپنے جسم ہی کا نہیں بلکہ روح کے مفاسد کا تدارک کر دو۔ اعلامیہ سے

بڑھ کر یہ کہ کلام ربانی کو سمجھ کر پڑھو۔ اور اس کے ذریعے اپنی نماز کو صحیح معنی میں نماز اپنے روزے کو صحیح معنی میں روزہ اور اپنی حیات کو صحیح معنی میں حیات مسلم بناؤ۔

اقبال نے اللہ اس کے مدارج کو اپنے پاس بلند کرے۔ ہماری موجودہ حالت کا نقشہ ان چار مصرعوں میں کھینچا ہے۔

مسلمانوں میں خون باقی نہیں ہے ⁂ محبت کا جنون باقی نہیں ہے
صفیں کج دل پریشاں سجدہ بے ذوق ⁂ کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

خدا آنے والے رمضان کو تمہارے لئے مبارک کرے اور اقبال کے سارے احترام کے باوجود خدا وہ دن لائے کہ کہنے والا اقبال کے اس قطعہ کو چاک کر کے پھینکے اور تمہارے جذب اندرون کی تعریف میں کائنات کا ذرہ ذرہ بول اٹھے۔

عطا اسلاف کا سوز دروں کر
شریک زمرہ لایحزنون کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
میرے مولیٰ مجھے صاحب جنوں کر

پمفلٹ بعنوان "اصلاح ملت" سلسلہ نمبر ۳
مرتبہ دائرۃ اصلاح حیدرآباد دکن
ماہ رمضان المبارک ۱۳۶۰ھ
صفحہ (۳ تا ۶)۔

عقدِ بیوگان

(بزرگان قوم علمائے کرام ومشائخین عظام
کی خدمت میں ایک اہم گزارش)

ہندوستان میں صدیوں سے مسلمانوں کے قیام نے تعلیمات اسلامی پر ہندوستانی تمدن وتہذیب اور معاشرت ومذہب کے بہت سے اثرات پیدا کئے۔ آج ہم اپنی گھریلو زندگی پر غور کریں تو وہ بڑی حد تک اِن اثرات سے متاثر نظر آتی ہے۔ ان اثرات نے نہ صرف ہمارے معاشرہ اور سماج ہی کو متاثر کیا بلکہ ہمارے بہت سے مذہبی احکام اور اصول پر بھی برا اثر ڈالا۔ آج جس بات کی طرف بزرگان مِلّت کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں وہ اس کی ایک بین مثال ہے۔

اسلام نے جو مذہب فطرت ہے۔ انسانی ضروریات کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر اور لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا کے ضابطہ کو پیش نظر رکھ کر مطلقہ یا بیوہ عورت کو نکاح ثانی کی عام اجازت دی اور سوائے امہات المومنین ازواج رسول رضی اللہ عنہا کے جن کو حکماً قرآن نے منع کردیا تھا۔ یہ اجازت ہر زمانے میں نافذ رہی۔ خود ازواج مطہرات میں سوائے عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے باقی سب بی بیاں بیوہ تھیں جب کہ ان سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے عقد فرمایا۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ جن کی

آل آج ہم سب کی سادات ہیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد نکاح میں آئیں تو یہ اُن کا تیسرا نکاح تھا۔ سید المرسلین کی صاحبزادیوں کے جن سے بڑھ کر کوئی اور شریف نہیں ہو سکتا۔ دو۔ دو عقد ہوئے اور ایسی ہی مثالیں ہم کو عہد ولایت میں بھی ملتی ہیں۔ ان سب عظیم الشان روایات کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو قوم کے ساتھ ہمارے میل جول نے اگر ہماری بیواؤں کو ستی ہونے نہ دیا تو اس سے بدتر عذاب میں ضرور مبتلا کر دیا ہے۔ اگر ہم غور کریں تو ایسی بیواؤں کی ایک طویل فہرست مرتب ہو سکتی ہے جو عین عالم جوانی میں بیواہ ہو گئیں اور اس بیوگی کی آگ میں آج تک جل رہی ہیں اور جو جل کر فنا ہو چکیں اُن کی گنتی صرف خدا جانتا ہے۔ میں ان کی اس مصیبت کا ذمہ دار تنہا ان کو نہیں بلکہ پورے سماج اور معاشرے کو سمجھتا ہوں اور آپ کی خدمت میں ایسے بزرگ کی حیثیت سے حاضر ہوا ہوں جن پر اللہ تعالیٰ نے ہمارے معاشرے کی اصلاح کی ذمہ داری رکھی ہے۔ ازراہ کرم میرے اس معروضہ کی پشت پر بیوہ کے عقد ثانی کے متعلق مذہبی نقطہ نظر سے نیز عام فلاح امت کے نقطہ نظر سے موثر الفاظ میں بہ دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ اظہار خیال فرمائیے تاکہ اس کو افراد ملت کی بصیرت عامہ کے لئے شائع کر دیا جائے۔ فقط

تاریخ مضمون

۱۹ر آبان سنہ ۱۳ف

م ۲۵ر ستمبر سنہ ۱۹۴۳ء

قلمی مسودہ

عقدِ بیوگان

اللہ تعالیٰ علی محمد خان صاحب کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے ایک نہایت ضروری مسئلہ کے متعلق علماء اُمت کے خیالات عالیہ سے قوم کے استفادہ کا سامان کیا۔ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ وہ جیسے جیسے تعلیمات اسلامی سے دور ہوتے گئے انھوں نے دوسروں کو متاثر کرنے کی بجائے دوسروں کے رسم و رواج سے خود متاثر ہونا شروع کر دیا۔ نکاح بیوہ سے اجتناب کی قبیح رسم ہم نے ہندوستان کے سوا اور دوسرے کسی اسلامی ملک کے مسلمانوں میں نہیں دیکھی۔ اور اس کے وجود وہی ہیں جو علی محمد خان صاحب نے اپنے زیر تبصرہ مکتوب میں بیان کئے ہیں۔

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے اور اس کی یہ خصوصیت اس کے تمام اجزاء کے فرداً فرداً اپنی جگہ قائم رہنے ہی سے پوری ہو سکتی ہے اس کے بعض احکام سے انکار یا یہی عملاً انحراف کر کے بھی کوئی اس کی تعلیمات کے پورے فوائد نہیں حاصل کر سکتی۔ اسلام کے فطری مذہب ہونے کا فائدہ اس کے ہر ایک حکم کی پوری پوری تعمیل کرنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے اور یہی معنی "ادخلوا فی السلم کافۃ" کے ہیں اور ایسا نہ کرنے والے کو قرآن نے سخت وعید سنائی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ۔

افتومنون ببعض الکتاب ❊ کیا تم اللہ کی کتاب کے بعض حصہ پر ایمان

فما اجزائہ من یفعل ذالک منکم الاخزی فی الحیاۃ الدنیا و یوم القیامۃ یردون الی اشد العذاب وما اللہ بغافل عما تعملون۔

لائے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو۔ پھر تم سے جو لوگ ایسا کریں ان کا بدلہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ دنیوی زندگی میں وہ رسوا ہوں اور قیامت کے دن ان کو سخت عذاب میں مبتلا کیا جائے (اور یاد رکھو) جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اللہ غافل نہیں ہے۔

نکاح بیوہ کی اسلام نے صرف اجازت ہی نہیں دی بلکہ وانکحوا الایامی منکم فرمایا کہ ہم کو محکوم کیا ہے کہ اپنی قوم کی بیواؤں کا نکاح کروادیں۔ گروہ مہدویہ کیلئے خصوصاً یہ نکتہ قابل غور ہے کہ جن اوامر قرآنی کو مفسرین نے بالعموم اخلاقی تعلیمات کی حیثیت دے اختیاری قرار دیا تھا ان کو حضرت مہدی موعود علیہ السلام نے واجب کا درجہ دیا۔ مثلاً کونوا مع الصادقین کا حکم عام طور پر اخلاقی تعلیم سمجھا جاتا ہے مہدوی صحبت صادقان کو نماز اور روزہ کی طرح فرض مانتے ہیں۔ اس لئے میں وانکحوا الایامی منکم کے حکم کو بھی اس حکم کی تعمیل کی (میں ذاتی طور پر واقف ہوں کہ ان کی کوشش سے دو تین شریف بیواؤں کے عقد ہوئے اور اب انھوں نے ایک قدم آگے بڑھا کر ہم سب کو ہمارا یہ بھولا ہوا فرض یاد دلایا۔

میں عموماً تمام مسلمانوں سے اور خصوصاً اپنی برادری سے جو عقد بیوہ کو عیب سمجھتی ہے اپیل کرتا ہوں کہ اس کی طرف متوجہ ہوں اور قوم کی جوان بیواؤں کو اس ظلم عظیم سے بچائیں جو ان کا دوسرا نکاح نہ کرنے اور ان کو زندہ درگور رکھنے کی وجہ ان پر ہو رہا ہے۔

ماہنامہ دائرہ۔ مقام اشاعت حیدرآباد
ایڈیٹر کاوش حیدرآبادی۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء

نواب میر عثمان علی خاں
آصف سابع

شاہ عثمان زندہ باد

الحمد للہ الذی ھدانا الی صراط مستقیم

ایہات المسلمین۔ مبارک ہیں وہ بندے جو ہر وقت اپنے خدا کی نعمتوں اور اس کے احسانات کو یاد کرتے ہیں اور اپنی بے بضاعتی کے باوجود کوشش کرتے ہیں کہ اپنی زبان اور عمل سے اس کا شکر ادا کریں۔ اس کی نعمتیں اور اس کے احسانات کا شمار ہمارے لئے محال اور ناممکن۔ دنیا کی بے حساب مخلوقات میں اشرفیت کا درجہ دے کر انسان پیدا کرنا پھر انسانوں کے اس گروہ کے طرف رہبری کرنا جو جو دین الہیہ حقیقیہ کی پیروی کر رہا ہو اور جس کو خود رب العزت نے امت وسط قرار دیا ہو کافی ہیں کہ ہمارا ہر بن مو سراپائے تشکر بن جائے۔

بھائیو۔ ہماری دینوی زندگی کی خوش حالی اطمینان اور فراغت کا انحصار اس امر پر ہے کہ وہ جو ہم پر حکمرانی کر رہا ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے امن و عافیت کا ذمہ دار بنایا ہے اپنی ذمہ داریوں کا احساس رکھتا ہو اور ہر وقت اس کے پیش نظر ہماری بہتری اور بھلائی ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم اس کے لاتعداد احسانات کے منجملہ ایک اس احسان سے بھی بہرہ اندوز ہیں کہ اس نے ہم کو رعایا پرور۔ عدل گستر۔ فرض شناس۔ نیک اور رحمدل بادشاہ عنایت فرمایا احسان فراموشی ہوگی اگر ہم اس کی نعمتوں کو یاد نہ کریں اور ان کے ازدیاد کے لئے دعا نہ مانگیں۔

کیا ہمارے لئے انتہائی فخر ومباہات کا باعث نہیں ہے کہ خدا نے ہم پر بادشاہت کرنے کے لئے ایک ایسی ہستی کو منتخب فرمایا جو عیش وعشرت سے ناآشنا لطف وراحت سے بے پروا اور صبح سے شام تک اپنی فقیرانہ وضع اور درویشانہ زندگی کے ساتھ ہمارے صلاح وفلاح کی فکر میں لگی ہوئی ہو جس کے دل میں خدا کا خوف اور اپنی ذمہ داریوں کی جوابدہی کا احساس ہو۔ جو ہماری مصیبتوں کو دیکھ کر تڑپ جاتا ہو اور جس کے لب ہماری مسرتوں میں خنداں ہو جاتے ہوں۔ مختصر یہ کہ جس کی زندگی کا مقصد ہماری بہتری اور خوش حالی ہو۔ آج ہم اس کے گزشتہ پچیس سالہ دور حکومت کی یاد تازہ کرنے بیٹھے ہیں۔ آیئے اس گزشتہ ربع صدی پر ایک سرسری نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ اعلیٰحضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ کے عہد میمنت عہد میں ہم کو کیا کچھ نصیب ہوا۔ کسی ملک کی سب سے بڑی دولت افراد ملک کی ذہنی وفکری ترقی ہے۔ اور وہ اس وقت تک نصیب نہیں ہو سکتی جب تک ہمارے دماغ نور علم سے منور نہ ہوں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ان چند درسگاہوں کے مقابلے میں جو آج سے پچیس برس پہلے انگلیوں پر گنی جاتی تھیں۔ آج ملک کا گوشہ گوشہ کس طرح آفتاب علم کی شعاعوں سے جگمگا رہا ہے۔ کیا یہ کم احسان ہے کہ غیر زبان میں حصول علم کی کوششوں کو آسان بنا کر مشکل سے مشکل فنون کو اپنی زبان میں آپ کی اولاد کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کو اور دارالترجمہ کی مساعی کو حیدرآباد ہی نہیں بلکہ ہندوستان احسان مندی کے ساتھ رہتی دنیا تک یاد کرتے رہے گا ہمارا ملک زرعی ہے اور ہمارے زراعت کے ذرائع آبپاشی ندیوں اور تالابوں پر منحصر ہیں۔ ذرا نظام آباد اور اس کی اطراف وجوانب کی جنت مثال زمین پر ایک نظر ڈالئے۔ عثمان ساگر۔ حمایت ساگر اور نظام ساگر کے عظیم الشان خزانہ

ہلئے آپ کو دیکھئے اور تصور کیجئے کہ کیا آپ کو دو چار الفاظ شکر آپ کے بادشاہ کے احسانوں کا پورا پورا بدل ہوسکتے ہیں۔ ان زراعتی ترقیوں کو زیادہ مضبوط بنانے کے لئے محکمہ زراعت کا قیام ملک کی صنعتوں کو ترقی دینے کی طرف توجہ آرائش بلدہ کے قیام سے بلدہ کی صحت و عافیت کو برقرار رکھنے کا خیال اور دوسرے طرف دارالسلطنت کی زینت آرائش۔ عدالتوں کو انتظامی صیغوں سے بالکل جدا کرکے ہمارے لئے حصول انصاف کو سہل بنا دینا اور اس طرح کی ہزاروں اصلاحیں دامن دل کو کھینچ رہی ہیں کہ جا اینجا است۔

ہم کیا اور ہماری مجال کیا کہ ان کا کما حقہ' شکر ادا کرسکیں۔ ہمارے اختیار میں اگر کوئی چیز ہے تو وہ ہمارا قلب اور ہماری زبان ہے۔ اپنے دل کو خدا کی طرف متوجہ کریں اور زبانوں سے اپنے اس رعایا پرور بادشاہ کے لئے دعا مانگیں کہ اے زمین و آسماں کے مالک اے شہنشاہ مطلق اور اے خالق کائنات اپنے لطیف عمیم اور اپنے فضل و کرم سے ہمارے سروں پر اعلیٰحضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخان بہادر خلد اللہ ملکہ' و سلطنتہ' کو باصد ہزار جلال و جبروت سلامت باکرامت رکھ۔ خداوندا تیرے بارگاہ میں ہم سب خطاوار ہیں اور کوئی بشر نہیں جو دعوے بے قصوری کرسکے اپنے حبیب کے صدقے سے ہمارے بادشاہ کو ہر قسم کی لغزشوں اور ہر قسم کی بشری غلطیوں سے محفوظ رکھ جس طرح تو نے اپنی نیک اور پسندیدہ بندوں کی حفاظت کی ہے۔ ان کے بے شمار بھلائیوں کا ان کو اچھا بدلہ دے اور نیکیوں میں اضافہ کی توفیق عطا فرما۔ ان کو ان تمام صفات سے بہرہ اندوز کر جو ایک بادشاہ کو تیری بارگاہ میں مقبول اور تیرے حبیب صلعم کے پیروؤں میں ممتاز بنا دیتی ہے۔ ان کے عدل کو باعث رشک عدل نوشیرواں کردے۔ ان کو حضرت ابو بکر کا حلم حضرت عمر کی تدبر و فراست

حضرت عثمان کی بخشش و عطا اور حضرت علی کی شجاعت و بسالت عطا فرما۔
ان کی سلطنت کو ہر قسم کے شر و فتنہ سے محفوظ رکھ اور دشمنوں کی نظر بد سے بچا۔
جس طرح برادر پر اُن کی بادشاہت کو تو نے تسلیم کروایا ہے اسی طرح اس پر اُن کی
حکومت اپنے پورے لوازم کے ساتھ مکمل کروا اُن کے سابقہ علاقہ کڑپا۔ کرنول۔
بلاری اور مچھلی بندر۔ ان کو واپس دلوا اور اُن کی بادشاہت کو اپنے تمام لوازم
خود مختاری کے ساتھ ان کی ہمعصر حکومتوں سے تسلیم کروا۔ اُن کو باصحت و عافیت
ہم پر حکمران رکھ۔ شہزادگان والاشان کو اُن کے زیر سایہ عاطفت مہمات سلطنت
میں ان کا دست بازو بنا۔ ان کے خانوادۂ شاہی کو خوشی و کامرانی نصیب کر۔
ان کی رعایا کے قلوب کو عقیدت و محبت کے جذبات صحیح سے معمور کر دے۔ اور
ہم کو توفیق عطا فرما کے ہم اسی طرح پچاس سالہ اور سو سالہ دور حکومت کا جشن
منائیں جس طرح آج ہم ان کی پچیس سالہ حکومت کی خوشیاں منا رہے ہیں۔
امین۔ ثمہ امین۔ یارب العالمین۔ بحق سید المرسلین۔

پمفلٹ بعنوان شاہ عثمان زندہ یاد
(۴ صفحات پر مشتمل)۔

حیدرآباد اور گھریلو صنعتیں

ہندوستان تاریخ کے ہر دور میں نہ صرف زرخیزی اور زرعی پیداوار کے لئے مشہور رہا ہے بلکہ اس کی صنعتی ترقی بھی بیرون ہند کے فاتحین کے لئے جاذب توجہ ہے ایک زمانہ تھا کہ اس کی صنعت و دست کاری میں بلند و اعلیٰ مقام رکھتی تھی اور یورپ و ایشیا کے اصحاب ثروت و استطاعت ان کو استعمال کرکے فخر کیا کرتے تھے ڈھاکہ کا ململ کشمیر کا پشمینہ بنارس کی زردوزی آج تک زبان زد خاص و عام ہے دکن کی وہ سطح مرتفع جو آج سلطنت حیدرآباد کہلا رہا ہے نہ اپنی صنعتی ترقی میں نہ کبھی کسی سے پیچھے تھی اور نہ آج اس کی صلاحیتیں بالکل فنا ہو چکی ہیں حکومت برطانیہ کے ہندوستان پر تسلط نے اور مشینری کے ذریعہ صنعت کی ترقی نے گو ہندوستانی دستکاری اور حیدرآبادی صنعتوں کو بہت نقصان پہنچایا اس کے باوجود ان کا اس وقت تک عالم وجود میں ہونا اُن کی صلاحیت حیات بقا، بہترین ثبوت ہے اور اُن کی ترقی کے امکانات کا یقین دلاتا ہے آج بھی آورنگ آباد کا ہمرو پٹن کی ریشمی اور زردوز تودین نرمل کی نقاشی اور لکڑی کے کھلونے کریم نگر کی چاندی کا نقش و نگار اور المند و گرمگال ... یڑہ اور نارائن پیٹھ کی پارچہ بافی سنگاریڈی و آرمور کی ریشمی بافت ورنگل کی قالین سازی بیدر کی دست کاری حیدرآباد کی وہ صناعیاں ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عہد زریں عثمانی نے جہاں ہماری ذہنی و سماجی زندگی کی ترقی پر

توجہ مبذول کی ہیں اس مبارک دور میں حیدر آباد کی صنعتی ترقی کو بھی نشاۃ ثانیہ حاصل ہوئی اور نا صرف پارچہ بافی کاغذ سازی شکر سازی وغیرہ کے بڑے بڑے مشینی کارخانے قائم ہوئے بلکہ ملک کے دستکاروں کی ہمت افزائی کرکے ان کے لئے سامان حیات اور ملک کے لئے اسباب ترقی مہیا کئے گئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ صنعتیں نمائشوں کے قیام اور فروخت گاہوں کے انتظام سے ان صنعتوں کی نکاسی کا بندوبست اور اپنے ملک میں ان کے استعمال کا شوق پیدا کیا گیا۔ لیکن جو کچھ ہوا اس کی نسبت نہیں کہا جا سکتا کہ وہ زمانہ کی رفتار ترقی کا ساتھ دے سکتا ہے مجلس اتحاد المسلمین نے اس کو آج سے کئی سال پہلے محسوس کیا اور نہ صرف مسلم باشندوں کی تا بقدر امکان خود امداد کا بیڑہ اُٹھایا بلکہ حکومت کی توجہ بھی اپنے نظام نامے کے ذریعہ گھر یلو صنعتوں کی ترقی کی طرف مبذول کرائی خدا کا شکر ہے کہ دنیا کی مابعد جنگ کے غلغلہ نے حیدر آباد کو بھی اس طرف متوجہ کر دیا ہے اور مستقبل کے متعلق تجاویز مرتب کرنے میں ملک کے اصحاب فکر مشغول نظر آتے ہیں۔

یہ امر مسلم ہے کہ اس زمانے میں دنیا کے تمام ممالک کی سیاست معاشی مسائل کے اطراف گھوم رہی ہے اور کوئی ملک اپنی فارغ البالی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ جب تک وہ اپنی ضروریات حیات کے لئے تا بحد امکان خو مکتفی نہ ہو اور کسی ملک کا خود مکتفی ہونا اس کی زرعی و صنعتی ترقی پر منحصر ہے صنعتی ترقی کی ایک صورت تو یہ ہے کہ بڑی بڑی مشینی صنعتیں قائم کی جائیں اور ملک کی خام پیداوار کو ضروریات ملک کے مطابق تیار کرنے کی کوشش کی جائے ابھی ہمارے یہاں ایسی وسیع صنعتوں کے لئے کافی گنجائش موجود ہے اعظم جاہی عثمان شاہی اور محبوب شاہی ملز جتنا کپڑا تیار کر رہی ہیں اس سے کئی زیادہ

روئی ہمارے یہاں سے برآمد ہوتی ہے اور اس کے امکانات ہیں کہ ہم اپنی پارچہ بافی کی مشینی صنعت کو ترقی دیں ہمارا ملک کل دنیا کی پیداوار کے پانچویں حصہ کے برابر روغنی اجناس پیدا کرتا ہے اور ان سے اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہمارے ملک کی معدنیات ابھی تک پردۂ خاکی میں روپوش ہیں اور ملک ان سے استفادہ کا حق رکھتا ہے۔ حکومت ان تمام اُمور کی طرف متوجہ ہے اور ضرورت ہے کہ ایک طرف ملک کے سرمایہ دار مواقع سے فائدہ اٹھانے پر آمادہ ہوں اور دوسری طرف ملک کے نوجوان ابھی سے ایسی تعلیم و تربیت حاصل کریں جو صنعتی ترقی کے لئے ضروری ہے لیکن ان بڑی اور وسیع پیمانے پر قائم ہونے والی مشینی صنعتوں سے جہاں پیداوار میں ترقی ہوگی وہیں اندیشہ ہے کہ بیروزگاری کی وباء ملک میں عام ہوتی جائے گی جو اس وقت دنیا کے بڑے صنعتی ملکوں میں پائی جاتی ہے ہندوستان جیسے آباد ملک کے لئے مشینی صنعتوں کے ساتھ ساتھ گھریلو صنعتوں کی ترقی دینے کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ دیہاتی صناعوں کو شہروں میں جمع ہوجانے سے روکا جائے اور ان کی موجودہ دستکاری سے فائدہ اٹھاکر ملک کو بیروزگاری سے بچایا جائے میں نے اضلاع رائچور و گلبرگہ کے دورہ میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا کہ مشینی پارچہ بافی کی ترقی نے جب دستی پارچہ بافی کے لئے بازار میں جگہ نہ رکھی تو سینکڑوں دستی پارچہ بافوں کے گھر اجڑ گئے اور وہ اپنے پیشے کو ترک کرکے ملازمت یا مزدوری پر مجبور ہوئے یا پھر انھوں نے ترک وطن کیا اور بیرون ملک کے کارخانوں میں روزی تلاش کرنے لگے۔

دستکاری اور گھریلو صنعتوں کے سلسلہ میں سب سے پہلی بات جو دریافت کرنے کے قابل ہے وہ ان صنعتوں کے انحطاط کی اصل وجہ ہے اور ان کے زوال کے اصلی اسباب ہیں جہاں تک میں نے تحقیق کی اور اس مسئلہ کا مطالعہ کیا تین ہیں۔

(۱) خام پیداوار کی فراہمی میں دشواری۔

(۲) بدلتی ہوئی دنیا کے ذوق کی مطابقت کرنے کے لئے صناعوں کی تربیت کا فقدان اور جدید آلات کے استعمال سے اُن کی ناواقفیت۔

(۳) مال کی تیاری کے ساتھ اس کی فروخت کی ذمہ داری کا بھی انھیں پر عاید ہوجانا اور ان کے مال کی نکاسی کا کوئی انتظام نہ ہونا۔

اگر ان اسباب زوال کو رفع کرنے کی کوشش منظم طریقے پر کی گئی تو مشینی صنعتوں کی ترقی کے باوجود مجھے یقین ہے کہ گھریلو صنعتیں نہ صرف زندہ رہ سکتی ہیں بلکہ بازار میں ان کا مقابلہ کرکے اپنی ترقی کے راستے نکال سکتی ہیں مثال کے طور پر پردیسی پارچہ بافی ہی کو لیجئے اگر اس قسم کی انجمن ہائے امداد باہمی قائم کیجائیں جو پارچہ بافوں کو سوت اور آلات پارچہ بافی فراہم کریں۔ تربیت یافتہ ڈیزائنرز کے ذریعہ ان کو بازار کے مقبول اور پسندیدہ ڈزائنز اور پارچہ بافی کی مطلوبہ قسم سے جس کی مانگ ہو واقف کرتے رہیں اور شہر ان کا تیار کردہ مال ان سے حاصل کرکے اس کی نکاسی کا بھی بندوبست کریں اور سروں پر مال کا بوجھ لئے گاؤں گاؤں اور گھر گھر پھرنے سے ان کو مستغنی کردیں تو مجھے یقین ہے کہ اُن کا بنایا ہوا پارچہ آج بھی ملک میں مقبول و کامیاب ہو سکتا ہے۔

میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ امداد باہمی کی کتنی انجمنیں اس وقت اس مقصد کی تکمیل کر رہی ہیں تو مجھے تعجب اور افسوس کے ساتھ معلوم ہوا کہ پارچہ بافان کمبل بافان اور قالین بافان کی ملک بھر میں صرف (۵۹) انجمنیں ہیں جن میں اس وقت کل (۱۲۵۳) ارکان ہیں میں ابھی تک یہ نہیں معلوم کرسکا ہوں کہ ان انجمنوں کا طریقہ کار کیا ہے اور ان سے ان صنعتوں کو کس حد تک فائدہ پہنچا ہے میں بھی کچھ دنوں قبل چین میں (کواپریٹیو انڈسٹریل موومنٹ) کی

ترقی پر بعض مضامین اور کتابیں پڑھ رہا تھا جو ۱۸ سے وہاں شروع ہوا ہے اس تحریک نے چین کی مصیبت زدہ اور جنگ کی وجہ سے تمام برباد آبادی میں ایک نئی لہر پیدا کر دی اور آج جب کہ چین کو رسد کی فراہمی کے تقریباً سارے راستے مسدود ہو چکے ہیں محض اس تحریک کی بدولت چین کے صناع اپنے ملک کو جنگ جاری رکھنے میں مدد دے رہے ہیں اور اپنی کثیر آبادی کو فاقہ کشی کی موت سے بچا رہے ہیں گو یہ تحریک چھوٹے پیمانے پر شروع ہوئی لیکن آج اس کا جال سارے ملک چین میں پھیلا ہوا ہے اور اس کی وجہ سے وہاں کے دیہاتی صناعوں نے مل کر کام کرنا اور تھوڑی محنت و سرمائے سے زیادہ نفع کمانا سیکھ لیا ہے غور کرنے سے یہ حقیقت ناقابل انکار معلوم ہوتی ہے مذکورہ تین اسباب انحطاط میں سے کسی ایک کی تلافی کر کے یا خود صناعوں پر اس کا پورا بار ڈال کر گھریلو صنعتوں کی ترقی کی توقع نہیں کی جا سکتی ضرورت ہے کہ ہمارا محکمہ امداد باہمی دیہی آبادی کو صرف قرضوں کے بوجھ سے نجات دلانے ہی پر توجہ نہ کرے بلکہ محکمہ صنعت و حرفت کے تعاون کے ساتھ ہر گاؤں کو ایک وحدت قرار دیکر وہاں جس قسم کی دستکاری اور صنعت پائی جاتی ہو اس کو اجتماعی اور امداد باہمی کے طریقے پر چلانے کی کوشش کرے صناعوں کو اشیاء خام فراہم کرے جدید آلات صنعتی سے روشناس کرے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کے تیار کئے ہوئے مال کی نکاسی کا انتظام کرے تاکہ وہ اطمینان سے اپنی صنعتی ترقی میں مشغول رہ سکیں گھریلو صنعتوں کا ایک قابل توجہ شعبہ زرعی صنعتیں بھی ہیں مثلاً باغبانی اس کے حاصل کردہ میووں کی حفاظت اُن سے مربّے اور چٹنیوں وغیرہ کی تیاری مرغبانی غیر جانوران زرعی وغیرہ سر رشتہ زراعت کی ساری کوششوں کے باوجود ہماری زراعت پیشہ آبادی ابھی

ان امور کی طرف متوجہ نہیں ہوئی ہے اور نہیں ہو سکتی جب تک افراد کو اس طرف متوجہ کرنے کی بجائے امداد باہمی کے اصول پر جماعتی طریقے پر کام کرنے کا ان کو عادی نہ بنایا جائے اور اس کا انحصار بھی سررشتہ زراعت کے ساتھ محکمہ امداد باہمی کے تعاون پر ہے اس کام کی طرف توجہ کرتے ہوئے گنوار دیہاتیوں کی اس ذہنیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہر نئی بات کو خوف کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اُن کا یہ خوف بڑھ جاتا ہے جب وہ یہ بات باہر سے ان کے سامنے آتی ہے اس لئے گھریلو اور زرعی صنعتوں کی ترقی میں یہ کوشش کرنا ضروری ہے کہ دیہات کے ایسے افراد کا تعاون حاصل کیا جائے جو تعلیم حاصل کرنے کے باوجود دیہی زندگی بسر کر رہے ہوں یا دیہی مدارس میں اس قسم کا نصاب دکھا جائے کہ وہاں کے تعلیم یافتہ عملی زندگی میں آنے کے بعد اپنے پس افتادہ ہموطنوں کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہو سکیں۔

آخر میں اس امر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس ترقی یافتہ دنیا میں صرف انسانی دست و بازو صحیح قسم کی قوت محرکہ نہیں ہو سکتے ہیں اور ضرورت ہے کہ برقی قوت محرکہ کو آبی طاقت سے بعجلت ممکنہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے حکومت کے سامنے یہ اسکیم برسوں سے شرمندہ تکمیل ہے جب تک اس کے ذریعہ ایک ایک گاؤں بجلی نہ پہنچادی جائے گی اور چھوٹی چھوٹی برقی مشینیں ہر گھر کو ایک چھوٹا کارخانہ نہ بنا دیں گی نہ ہم ملک کی صنعتی ترقی کا یقین کر سکتے ہیں نہ اپنے ملک کو مابعد جنگ پیدا ہونے والے عام بیروزگاری سے بچا سکتے ہیں۔

نواب بہادر یار جنگ کا عنفوان شباب

میں مُطالعہ کسطرح کرتا تھا

میری حالت ان نوجوانوں سے مختلف نہ تھی جو ابتدائی درسی کتابوں سے فارغ ہوکر عام مطالعہ کی ابتداء کرتے ہیں اس عمر میں جب کہ دماغی صلاحیتیں پوری طرح ابھری ہوئی نہیں ہوتیں اچھی اور بُری کتاب کی تمیز بہت کم ہوتی ہے قصص اور حکایات مبتدی کی توجہ کو جلد اپنی طرف پھیر لیتے ہیں۔ میرے مطالعہ کی ابتداء بھی حکایات و قصص سے ہوئی۔ مدرسہ اور گھر پر اساتذہ کی گرفت سے چھوٹنے کے بعد جو اوقات فرصت مل جاتے وہ زیادہ تر کسی ناول یا افسانے کی نظر ہو جایا کرتے تھے۔ کھیل کود سے مجھے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی یا یہی بات یہ ہے کہ کھیل کود کے قابل ہی نہیں بنایا گیا تھا۔ قد کی بلندی نے اب اعضاء میں تھوڑا تناسب پیدا کر دیا ہے۔ ورنہ اپنی عنفوان شباب کی تصویر دیکھتا ہوں تو موجودہ متحارب اقوام کے بنائے ہوئے کسی آتش افروز بم کی تشبیہ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ چار قدم چلتا تھا تو ہانپنے لگتا تھا اور کھیلنے کے بجائے خود دوسروں کے لئے تماشہ بن جاتا تھا۔ اس لئے میری زندگی کا عملی دستور "اگر خواہی سلامت برکنار است" تھا۔ نگاہیں کبھی کھیلتے ہوئے احباب پر پڑتی تھی اور کبھی صفحات کتاب کے میدان میں دوڑنے لگتی تھیں اور جب پلے گراؤنڈ سے اُٹھ کر گاڑی میں سوار ہوتا تو مدرسہ سے گھر پہنچنے تک ناول کے ایک دو باب ضرور ختم ہو جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس شوق نے جنون کی شکل اختیار کر لی۔

میوہ خوری کے نام سے جو کچھ ملتا وہ کتابوں کی نذر ہو جاتا۔ اتالیق سمجھا کر تھک جاتے اور ناشتے کے دستر خوانوں پر بھی ہمارے ہاتھ سے کتاب نہ چھوٹا کرتی تھی۔ عمر جیسے جیسے بڑھتی گئی یہ جنون ویسے ویسے اعتدال پر آتا گیا۔ ایک طرف موضوع مطالعہ میں تبدیلی ہوئی اور افسانوں اور حکایات کی بجائے سوانح عمری اور سیرت کا مطالعہ شروع ہوا اور مطالعہ کے اوقات معین و متعین ہونے لگے۔

بیسویں صدی عیسوی کے ہر نوجوان کی طرح شاعری کا خبط شعور کی ابتداء کے ساتھ پیدا ہو چکا تھا۔ اور شوق شعر گوئی نے شعراء کے تذکروں اور دواوین کی طرف متوجہ کر دیا تھا آج اپنے کلام کا پرانا نمونہ سامنے آجاتا ہے تو بے اختیار ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے لیکن آج سے (۲۵) برس قبل ہم اپنے آپ کو غالب اور ذوق سے کچھ زیادہ نہیں تو کم بھی نہ سمجھتے تھے۔ ہماری شعر گوئی اور مطالعہ دواوین کا سب سے اچھا وقت صبح کے ابتدائی لمحات ہوا کرتے تھے۔ لیکن جیسے جیسے ادب نے ایک معیاری کیفیت پیدا کی تو خود بخود یہ احساس ہونے لگا کہ شاعر پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں۔ اور ہماری میز سے ہٹکر دواوین الماریوں کی زینت بنتے گئے اور بانگِ درا کے سوا میز پر کچھ باقی نہیں رہا۔ آخری دور میں اگر کسی کے کلام نے اقبال کے کلام کا ساتھ دیا تو وہ مولوی روم کی مثنوی اور سعدی کی گلستاں تھی۔

مطالعہ کا طریقہ یہ تھا کہ ایک پنسل ہاتھ میں اور ایک نوٹ بک جیب میں ہوتی میرے کتاب خانہ میں مشکل سے کوئی کتاب ہوگی جس پر تاریخ ابتداء اور انتہائے مطالعہ درج نہ ہو جو فقرے ادبی، تاریخی یا کسی اور حیثیت سے پسندیدہ ہوتا اس پر یا تو کتاب ہی میں نشان لگا دیا جاتا اور بار بار اس پر نظر ڈالی جاتی یا پھر نوٹ بک پر درج کر لیا جاتا اور اس کو یاد کرنے کی کوشش

کی جاتی والد مرحوم کی خدمت میں شمالی ہند کے اکثر اصحاب تشریف لایا کرتے تھے ان کی گفتگو سن کر اپنی زبان کے نقائص کا احساس بڑھتا گیا۔ نتیجہ سب سے زیادہ توجہ زبان کی درستی پر مرکوز رہی کوئی اچھی ترکیب سے کوئی انوکھی تشبیہ کوئی انوکھا استعارہ نظر سے گزرتا تو سب سے بڑی فکر یہ دامن گیر ہو جاتی تھی کہ اسکو جلد سے جلد صحیح طریقے پر اپنی گفتگو میں استعمال کر لیا جائے ابتداً یہ تمنا صرف جذبۂ خود نمائی کا نتیجہ تھی لیکن بعد میں ثابت ہوا کہ حافظہ کسی بات کو اس وقت تک صحیح طور پر محفوظ نہیں رکھ سکتا جب تک ایک مرتبہ زبان یا قلم اس کو استعمال نہ کرے آج اپنی زندگی میں اپنی اس ابتدائی عادت کے نتائج کو پوری طرح کارفرما دیکھتا ہوں اس عادت نے رفتہ رفتہ شدت اختیار کر لی تھی کہ میں اچھے ادیبوں کے کئی کئی فقرے بے تکلف اور بلا کسی کم و بیش کے استعمال کرتا تھا۔ اور یہی میری زبان کی درستی کا سب سے بڑا آلہ ثابت ہوا۔

جب ہم اپنے گھر میں جوان اور بڑے سمجھے جانے لگے تو ہماری بیٹھک کے کمرے الگ کر دیئے گئے تھے اور احباب کی محفلیں جمنے لگی تھیں۔ لغویات سے فطرۃً نفرت تھی علم و ادب زندگی کا سب سے دلچسپ مشغلہ بن گئے تھے۔ ابتداً محض تفریح کے طور پر میں نے اپنے احباب کے ساتھ مل کر مطالعہ کرنا شروع کیا۔ یعنے یہ ہوتا کہ۔ الہلال۔ ہمایوں۔ ہزار داستان معارف۔ زمانہ یا کوئی اور معیاری ادبی و علمی رسالہ یا کوئی اچھی کتاب کسی ایک صاحب کے ہاتھ میں ہوتی اور اکثر میں ہی قاری کی خدمت انجام دیا کرتا۔ ایک ایک فقرے پر ہم اکٹھے خیال آرائیاں ہوتیں اختلاف و اتفاق ہوتا بحث و تکرار ہوتی اور یہ بحث دماغ کے صفحہ پر خیالات کے کبھی نہ مٹنے والے۔ تسامات کا باعث بنتی۔ تجربہ نے بتلایا کہ خاموش اور انفرادی مطالعہ سے یہ مشترک مطالعہ

کا طریقہ زیادہ مفید اور زیادہ کارآمد ہے جب سیر و تراجم تذکرہ و تاریخ سے آگے بڑھ کر ذوق مطالعہ نے ٹھوس اور سنجیدہ فلسفیانہ و سیاسی اخلاقی و مذہبی علوم کی طرف توجہ کی تو ایک اور طریقے نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا۔ فلسفہ اور علم کلام یا مذہب و سیاست کے کوئی مقامات اگر سمجھ میں نہ آتے تو میں ان کو اپنی اس چھوٹی نوٹ بک میں جو میرے جیب کا مستقل سرمایہ بن گئی تھی نوٹ کر لیا کرتا اور جن بزرگوں کی نظر ان علوم پر میرے نزدیک عمیق تھی ان سے ملاقات کے جلد سے جلد مواقع تلاش کرتا اور ان سے ان اشکال کو حل کرنے کی کوشش کرتا آج اپنے ان لمحات کو اپنی حیات گزشتہ کا سب سے قیمتی سرمایہ سمجھتا ہوں۔ لوگ صرف کتاب پڑھنے کو مطالعہ سمجھتے ہیں میرے نزدیک کسی کے مطالعہ کا مطالعہ بھی سب سے اچھا مطالعہ ہے جب والد مرحوم کے انتقال کی وجہ سے اٹھارہ برس کی ابتدائی عمر ہی میں میرے سر پر گھر کی ساری ذمہ داریوں کا بوجھ پڑ گیا اور مدرسہ کی تعلیم ناقص حالت میں ختم ہو گئی۔ تو میرے مطالعہ کا سب سے بہترین طریقہ یہ تھا کہ جن لوگوں نے مختلف اصناف علم میں زیادہ سے زیادہ مطالعہ کیا ہو ان کو اپنے اطراف جمع کر لوں یا اُن کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں اور اُن کی عمر بھر کے مطالعہ کا نچوڑ ان سے سنوں اور پھر کانوں کے ذریعہ اس کا مطالعہ کروں اسی تمنا نے آوارہ گردی و صحرا نوردی پر آمادہ کیا مصر و شام۔ عراق۔ ترکیہ۔ ایران و افغانستان کی مشکل سے کوئی اہم ہستی ایسی ہو گی جس سے شرف تقرب کی کوشش نہ کی ہو اور آج اپنے قلب اور دماغ کو اُن کے مطالعہ کے نتائج کا مرہونِ منت پاتا ہوں۔

لوگ اوراق کاغذ کے مجموعے کو لٹنے اور اس پر لکھی ہوئی سیاہ لکیروں

کو پڑھنے کا نام مطالعہ سمجھتے ہیں۔ میرے پیش نظر ہمیشہ سے ایک اور کتاب رہی ہے جس کے صرف دو ورق ہیں لیکن جس میں سب کچھ ہے اور یہ کتاب صحیفہ کائنات ہے۔ آسمان اور زمین کے ان دو اوراق کے درمیان مہر و ماہ کواکب و سیارات شفق قوس قزح ابر و باد کوہ و صحرا۔ سمندر اور ریگستان نے ایسے ایسے خطوط کھینچے ہیں جن میں فکر کرنے والی نگاہ اپنے لئے سب کچھ حاصل کر سکتی ہے مجھے اس کتاب کی طرف آذر کے بیٹے نے متوجہ کر دیا جس نے ڈوبتے ہوئے تاروں اور غروب ہوتے ہوئے چاند اور سورج کو دیکھکر لا احب الآفلین اور فاطر السمٰوات والارض کا پتہ چلایا تھا میری اس خیال کی تصدیق حرا کے بیٹھنے والے نے بھی کی اور یہی دو مجھے اس مطالعہ کی طرف متوجہ کرنے کا باعث ہوئے اور یہ پہچانتے ہیں زیادہ دیر نہ لگی کہ کس طرح دنیا میں اُگنے والے درختوں کا ہر ورق معارف کردگار کا ایک دفتر ہے۔

آہ دنیا بدل گئی فرصت کے وہ رات دن اب خود میرے لئے افسانہ بن گئے اب ان کو جی ڈھونڈتا ہے مگر پا نہیں سکتا۔ قوم و ملت کی جو ذمہ داریاں ہم نے ابتداً اوقات فرصت کو صرف کرنے کے لئے اپنی مرضی سے قبول کی تھیں اپنی زندگی کے سارے لمحات پر مسلط ہو گئیں کتاب سامنے آتی ہے تو تنگی وقت کا تصور آہ بن کر زبان سے نکلتا ہے اخبار ہی پڑھنے سے فرصت نہیں کتاب کا ذکر کیا۔ اب کتاب پڑھنے کی سب سے اچھی جگہ ریل گاڑی کا ڈبہ ہے اور سفر کی وہ منزلیں جو طے ہونے سے رہ جائیں جب سفر پر جاتا ہوں تو سامان کے صندوق کے ساتھ ان کتابوں کا ایک ڈبہ ہوتا ہے جن کو اس عرصہ میں پڑھنے کے قابل سمجھ کر جمع کر لیا ہوں اور غنیمت سمجھتا ہوں کہ زندگی کے گزرتے ہوئے لمحات کی یاد سفر کے ان اوقات میں تازہ ہو جاتی ہے۔

ہماری کتابیں۔ ماہ مہر ۱۳۵۱ف م اگست ۱۹۴۲ء جلد (۱) نمبر ۳۔ مدیر سید علی شبر حاتمی صفحہ نمبر ۴ تا ۷

۲۹ر اسفندار ۱۳۵۳ ف
مطابق
یکم فروری ۱۹۴۴ء

جناح پہلی نظر میں ــــ ایک تاثر

آج سے دس برس پہلے ربیع الاول کا مہینہ تھا اور مجھ سے مسلمانان بمبئی نے خواہش کی تھی کہ بمبئی کے عظیم الشان جلسہ میلاد النبی کی صدارت کروں۔ سر کاؤس جی جہانگیر ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور اپنے و بیگانے۔ دنیا کے سب سے بڑے مقنن سب سے بڑے جرنیل۔ سب سے بڑے ریفارمر سب سے بڑے انقلابی غیر اللہ کے سب سے بڑے باغی اور اللہ کے سب سے بڑے نبی کے حالات سننے کو جمع تھے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ مجلس استقبالیہ کی صدارت کون کر رہے تھے۔ مگر اتنا یاد ہے کہ صدر مجلس استقبالیہ کا خطبہ پڑھا جا رہا تھا۔ کہ جلسہ میں ایک عام ہیجان پیدا ہوا اور لوگوں نے "اللہ اکبر" کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ خطبہ میں کوئی ایسا غیر معمولی مقام نہ تھا جس پر اتنے جوش کا اظہار کیا جاتا۔ میں نے جلسہ میں چاروں طرف متجسس نگاہ ڈالی اور ایک دبلے پتلے آدمی کو گورے رنگ، اونچی ناک، مضبوط جبڑوں، درخشاں پیشانی اور سینہ کو چیر کر دلوں تک گھس جانے والی تیز نگاہوں کے ساتھ۔ اپنا مضبوط ہاتھ کھلی ہوئی لمبی لمبی انگلیوں سمیت پیشانی سے لگائے۔ صاف ستھرا اور استری کیا ہوا سوٹ پہنے ننگے سر نعروں کا خاموش لیکن دلوں کو موہ لینے والا جواب دیتا ہوا دیکھا۔ میز سے لگی ہوئی میری بازو والی کرسی پر

قاید اعظم اور قاید ملت

جلسہ کے منتظم اور سکریٹری سیٹھ ذکریا مینار جیٹھ تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ یہ ہیں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح جو کبھی نام نہاد آل انڈیا نیشنل کانگریس کے روح رواں تھے۔ ہندوستانی قومیت کے علمبردار تھے۔ مخلوط انتخاب کے حامی تھے اور انگلستان کے مشہور بیرسٹر تھے اور آج مسلمانوں کی آنکھ کا تارا۔ ہندوستان کی ملت اسلامیہ کا سہارا۔ کانگریس کے فاتح اور مسلم لیگ کے علمبردار ہیں جنھوں نے مسلمانوں واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا ولا تفرقوا کا سبق پھر ایک مرتبہ پڑھانے کا عزم کر لیا ہے اور سب کی غلامی سے چھوٹ کر محمد رسول اللہ کے آستانہ سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ مسٹر جناح ڈائس پر بچھی ہوئی پہلی صف کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئے۔ خطبۂ استقبالیہ ختم ہوا اور میں نے اپنا خطبہ صدارت شروع کیا۔ کاؤس جی جہانگیر ہال کے ہزاروں سامعین کا اجتماع میری ابرو کو جنبش بھی نہ دے سکتا تھا لیکن قائد اعظم کی شخصیت اور رعب میرے قلب پر چھایا جا رہا تھا اور میری زبان سینکڑوں تجربوں میں کامیابی کے باوجود رکتی محسوس ہوتی تھی اور میری فکر جس کو الفاظ کے انتخاب میں ادنیٰ لیس و پیش بھی نہ ہوا تھا۔ ہر لفظ اور جملہ کو جنتے وقت تامل کرتی تھی کہ ایک جوہری بیٹھا ہے کہیں اس کی ٹکسال میں میری جنس کھوٹی نہ ثابت ہو۔ گو یہ تامل اور جھجک عارضی تھی لیکن اس نے میرے خطبۂ صدارت کو خزف سے الماس بنا دیا۔ خطبۂ صدارت ختم ہوا اور تکبیر کے نعروں میں محمد اور علی کے ناموں سے نسبت رکھنے والا عقل و دل کے جناحین پر خود بھی عرش کی سیر کرنے لگا اور اپنے سامعین کو بھی فرش سے بلند کرنے لگا۔ تقریر مختصر تھی جس کے ابتدائی جملے میرے لئے سند تھے اور آخری حصہ قانون محمدی کا دنیا کے دوسرے مشہور قوانین خصوصًا "رومن لا" سے متقابل مطالعہ تھا۔ موجودہ قوانین کا ایک عالم متبحر مسٹر جناح کی زندگی "رومن لا"

کی ذریات کو اپنی آغوش میں پرورش کرتے ہوئے گزری۔ جب محمدی قانون کے گوشے کھولنے لگا تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ تعلیم مغرب کے شیدائیوں نے حسن محمدی کے کیسے کیسے جلوے دیکھے ہوں گے۔ برخواست کے وقت مجھے تعارف کی مسرت حاصل ہوئی اور دوسرے دن "لٹل گمنز روڈ" کی مختصر مگر آراستہ کوٹھی میں ملاقات کا شرف نصیب ہوا۔ ملاقات کی ابتداء میں مجھ پر ان کی شخصیت کا رعب طاری تھا لیکن چند لمحوں بعد معلوم ہوا کہ انسان کی سب سے بڑی بڑائی یہ ہے کہ وہ چھوٹوں سے چھوٹا ہو کر ملتا ہے۔ میں اس وقت تک سیاسیات سے کوسوں دور تھا۔ حیدرآباد کی فضاء امن و سکون سے ہم آغوش تھی۔ برطانوی ہند کے ہنگامے ابھی ریاستی ہند کے حدود کو عبور نہیں کرنے پائے تھے۔ ۱۹۲۵ء کا قانون حکومت ہند اپنی آب و گل میں آغشتہ تھا۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے بعد شائع شدہ وائٹ پیپر (کاغذ ابیض) سیاسیات ہند کے ماہرین کی توجہ کا مرکز تھا۔ انگلستان میں جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی نے اپنے کاروبار شروع نہیں کئے تھے۔ سیاسیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے چند سوالات کئے اور ہندوستان کے استاد سیاست نے مسکراتے ہوئے ان کے چند گوشے کھولے۔ مسٹر جناح ابھی تک ہندوستان میں انگلستانی پارلیمانی جمہوریت کا تجربہ کرنے پر مصر تھے۔ جداگانہ انتخابات کے قائل ہو چکے تھے لیکن اقبال کے تصور قومیت کو اس کی بنیاد پر ہندوستان کے شمال مغربی گوشے میں اسلامی سلطنت کے قیام کو ایک ناقابل عمل لیکن خوش آئند نظریہ تصور کرتے تھے اور مسز سروجنی نائیڈو کے الفاظ میں ابھی تک

Ambassador of Hindu Muslim Unity.

بنے ہوئے تھے مجھ اقبال کے حلقہ بگوش کو ان کی سیاست اپنی طرف زیادہ مائل نہ کر سکی اور میں اس ملاقات کی یاد لئے ہوئے بمبئی سے حیدرآباد واپس آیا فقط

(قلمی مسودہ)

شاعری

اس دن کرۂ ہوائی میں شادیانے بجے ہوں گے اور سمع انسانی نے خوشیاں سنائی ہوں گی جب کہ فرزند آدم کی زبان سے پہلی مرتبہ کلام موزوں نکلا ہوگا۔ تاریخ ساکت ہے اور ہمارا علم تہی دامن کہ اس کلام موزوں کا موضوع کیا ہوگا وہ جذبات عشق و محبت تھے یا نفرت و عداوت۔ ہجو غیر تھی یا ستایش خویش۔ پستی کا احساس تھا یا عظمت و شان کا اظہار لیکن شاعری اگر کسی وجدانی کیفیت کا نام ہے تو ہم کم از کم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس کلام موزوں کا اتباع کرنے والوں کو "غاوون کا" لقب نہ ملا ہوگا خدا نے ام الکتاب میں سب سے پہلے اپنی صفات ربوبیت و رحمت کا ذکر کیا ہے کیا تعجب ہے کہ اس اشرف المخلوقات نے رب رحیم کے جلوہائے حسن و جمال ہی سے سب سے پہلے تاثر قبول کیا ہو اور اس کی حمد و ثنا میں زبان کھولی ہو زمانہ مابعد تاریخ کی ساری تحقیقات متفق ہے کہ شعر کے ذریعہ اظہار احساسات جذبات کا شوق دنیا کی ہر قوم میں رہا ہے چاہے وہ امریکہ کی فلک بوس عمارتوں میں رہنے والی ہو یا افریقہ کے بے نیاں جنگلوں میں۔ اسی صدائے اولین کی بازگشت تھی جو ہومر نے یونان میں امرا القیس نے عرب میں فردوسی نے ایران میں شکسپیر نے انگلستان میں گوئٹے نے جرمنی میں ٹیگور اور اقبال نے آریہ ورت میں بلند کی اور اسی پہلی شاعری کے نقش قدم ہیں جو اتنے روندے گئے کہ آج زمین کا چپہ چپہ

الغیض سے معمور نظر آرہا ہے اگر فی الحقیقت شاعری اس جادو کا نام ہے جو زبان شاعر سے نکل کر قلوب انسانی کو مسخر کرتا ہے تو ایسے جادوگر ہر قوم میں ضرور پیدا ہوئے لیکن ایک دو سے زیادہ نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میرے اس خیال سے اختلاف کیا جائے گا لیکن مجھے کہنے دیجئے کہ ہر شاعر انسان ہو سکتا ہے مگر ہر انسان شاعر نہیں ہو سکتا ممکن ہے کہ مشق و محنت ہم کو اپنے خیالات کو منظوم کر دینے کے قابل بنا دے لیکن وہ جذبہ اور کشش جو شاعری کی جان ہے بس کی نہیں ہے وہی شاعری میں پائی جا سکتی ہے۔ شاعر۔ فطرت و قدرت کا وہ شاگرد رشید جس کی عقل پردوں کو اٹھاتی جس کی آنکھیں اسرار کو دیکھتی اور جس کی زبان حقیقتوں کو مجاز کی صورت میں ہمارے آگے پیش کر دیتی ہے کیا فی الحقیقت اتنا نا قابل اعتناء ہے کہ ہر فرزند آدم فطرت کی عطاء اور قدرت کی دین کا اندازہ کئے بغیر اس کی ریس کرنے لگے اور دنیا کے اسٹیج پر اس کا سوانگ بھر کر شاعری کو تبسم ریز اور شاعر کو چین بہ جبیں کر دے۔ تاریخ کا متعلم جانتا ہے کہ قوموں کے بننے اور بگڑنے میں اس تلمیذ رحمٰن کی زبان کو کتنا تعلق رہا ہے کیا ہم نہیں جانتے کہ اس کی رزمیہ نظمیں خرمن امن کے لئے برق سوزاں ہوتی تھیں اور اس کے محبت سے بھرے ہوئے اشعار ٹوٹے ہوئے دلوں کیلئے آہنی زنجیر۔ کیا پست اور گری ہوئی قوموں کی رفعت و بلندی کے اسباب میں آپ شاعر کے قلم کو نہیں پاتے اور کیا غیرت و حمیت سے محروم ملل نے اس کے دل سے اٹھتی ہوئی آوازوں سے خودشناسی و خودداری نہیں حاصل کیا اور کیا شاعری کا اس سے اچھا مقصد اور اس سے بہتر مطمع نظر کچھ اور بتایا آج بھی پیش کیا جا سکتا ہے لیکن آہ برا ہو اس دن کا جب کہ شیطان لعین کو قلب انسانی میں تمکن اور استقرار کی اجازت ملی تھی کہ اس ایک

پاکیزہ طریقۂ اظہار جذبات کو بھی اس نے اپنا آلۂ کار بنائے بغیر نہیں چھوڑا وہی شعر جو داؤد کی زبان سے نکل کر رشک صد ہزار عبادت ہو جاتا تھا۔ امراء القیس کے ناپاک جذبات کا حامل بن کر سمع حق شنو کے لئے بار ہونے لگا۔ وہی شعر جو مناظر فطرت اور مظاہر قدرت کی تصویریں کھینچکر ہم کو تجلیات الٰہی سے قریب تر کرتا تھا خال و خط کی ثنا خوانیوں میں گرفتار ہو کر جذبات حیوانی کا محرک بن گیا خصوصًا مشرق میں ایران کی تعیش پسند فضاء نے اس کو نفس امارہ کے ہیجان کے لئے مخصوص کر لیا اور دنیا کی مادی آنکھوں نے فی کل واد کے نظارے دیکھ لئے بے شک زمانہ جب تک حسن و جمال اور جذبات و احساسات رکھتا ہے اس وقت تک مذاق شعر ناپید نہیں ہو سکتا اور نہ شعریت فنا ہو سکتی ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ مشق سخن ہی قدرت کی عطاء شعر گوئی کو پہچاننے کا ابتدائی طریقہ ہے لیکن کیا ہم ان رہروان وادی شعر سے جو اپنی قابلیت اور فطرۃ کا اندازہ کئے بغیر اپنے آپ کو شاعر بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ درخواست کریں کہ اپنی سوتی ہوئی شاعرانہ قوتوں کو تلاش کرنا بے شک مستحسن لیکن دربار فطرت سے شاعر بننے کا استحقاق حاصل کئے بغیر شاعر بننے کی کوشش کرنا کم از کم اس بیسویں صدی میں جو عملیت و فعالیت کا دور ہے تضیع اوقات ہوگا۔ شاعری ایک بھڑکتی ہوئی آگ ہے جس کے شعلے باریک سے باریک سوراخ سے بھی نمودار ہو جاتے ہیں اور اگر باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں پاتے تو ان سے پیدا ہونیوالی بھاپ اپنے ظرف کو توڑ دیتی ہے اور اس کو وہ آتش فشاں سے عالم کائنات گونج اٹھتا ہے اگر تم شاعر ہو تو تمہاری شعریت نہ قافیہ اور ردیف کی محتاج ہے نہ علم عروض کی حاجتمند وہ تمہاری زبان کے ہر لفظ سے نمودار ہوگی اور اس کا مقام سننے والے کا کان نہیں دل ہوگا۔

عزیزو زمانہ بدلتا رہا ہے اور اس کے ساتھ اس کی ضرورتیں بھی بدلتی رہی ہیں۔ ملکوں میں انقلاب آئے اور قوموں نے عروج و زوال دیکھے ان تغیرات کے ساتھ ساتھ شاعر کا ماحول بدلا ان انقلابات نے شاعر کی خیالی دنیا کو بھی منقلب کیا وہ دربار وقت کا نقیب ہے اس کی آواز اپنے وقت کی ضروریات کے لحاظ سے بلند ہوتی رہی شعرائے عالم کے شاہکار ہمارے اسی نظریئے کا ثبوت ہیں اسلامی دنیا میں جب تک خالد و عبید اللہ کی ضرورت تھی حسان ابن ثابت اور خنساء جیسے شاعر پیدا ہوئے لیکن جب بنی امیہ کے عیش پسند اور بنی عباس کے عشرت دوست درباروں نے اپنا رنگ بدلا تو شاعری اس کے اثر سے مغلوب ہو گئی سلاجقہ اور سلاطین مغلیہ کے دربار میں پہنچکر اس میں گل و بلبل اور مژگان و کاکل کے سوا کچھ باقی نہ رہا تھا بہادر شاہ سے دلی چھوٹ رہی تھی لیکن ایک مردہ قوم کا مردہ بادشاہ لوہے کے تیر اور فولاد کی تلوار کے بجائے مژگان و ابرو کی مشق میں مشغول تھا ہشام ابن عبدالملک، اور مامون الرشید جلال الدین ملک شاہ سلجوقی اور اکبر کا زمانہ ہوتا تو شاید ہم بھی اس مذاق شاعری کی ثنا کرتے کہ جنگ و جدل اور کارزار و عمل کے بعد یہ انداز شاعری ایک گونہ تنشیط خاطر کا باعث ہوتا لیکن کیا آج اور اس زمانہ میں مشرق اور خصوصًا ہندوستان کی غلام قوموں کے لئے اسی شاعری کی ضرورت ہے کہ امید وصل میں دم توڑیں اور شب ہجر کا دامن تلاش کریں آج بزم نشاط کی زینت درکار نہیں ہے میدان رزم و حریت کا ولولہ مطلوب ہے۔ کیا میں شعراء سے درخواست کروں کہ وہ اپنی ضرورت کا اندازہ کریں اور اپنے مریض کو وہی دوا دیں جس کی اس کو ضرورت ہے ہم مانتے ہیں کہ شاعری کا تعلق کسی خاص عمر سے نہیں ہے،

شاعر بڈھا ہو کر بھی جوان کے جذبات رکھ سکتا ہے اور عین عالم جوانی میں بھی پیر صد سالہ کی عاقبت بینی اور فطرت شناسی کا ثبوت دے سکتا ہے لیکن اگر اس کا موضوع صرف ہجر و وصل اور کاکل و مژگاں ہی ہے تو مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ زمانہ طالب علمی اور عنفوان شباب اخلاقی اور تعلیمی نقطۂ نظر سے اس کے لئے کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا بلکہ اندیشہ ہے کہ ہم کو شعر کی تعریف میں "ان من الشعر لحکمۃ" کی بجائے "شیطان کا شریک و سہیم" کہنے کی نوبت نہ آجائے کوئی شک نہیں کہ زمانہ طالب علمی ہی قوائے شعر گوئی کی پرورش کا زمانہ ہے لیکن اس عمر میں مشاعروں کی شرکت اور وقف شعر و سخن ہو جانا اپنی تعلیم کے قیمتی اوقات کو ضائع کرنا نہیں تو اور کیا ہو سکتا ہے۔ میری ان پراگندہ خیالوں میں نگاہ ظاہر بین کو ممکن ہے کہ شعر و شاعر کی تنقیص نظر آئے لیکن اس کے بالعکس میں ان دونوں سے انتہائی عقیدت و محبت رکھتا ہوں گفتگو صرف موضوع طبیعت مذاق اور وقت شعر گوئی سے متعلق ہے شعراء سے درخواست ہے کہ زمانہ کی ضرورت کے موافق موضوع تلاش کرنے کی کوشش کریں مذاق و طبیعت کے لئے زمانہ کے تغیرات کا مطالعہ کریں اور ان سے اثر پذیر ہوں اور قوم کی ابھرتی ہوئی پود سے درخواست ہے کہ شاعری کا بار گراں مضبوط کاندھوں اور پختہ دماغوں کے لئے ہے اپنی نرم اور لچکتی ہوئی ڈنٹھل کو اس کے نیچے دبا کر نشو و نما کا خون نہ کریں۔

المصدق

جلد (۱۲) نمبر (۱۱)

ماہ ذیقعدہ ۱۳۵۱ ہجری

فطرت کائنات

دنیا میں جب نگاہیں دیکھنے کے قابل۔ کان سننے کے لائق اور دل سمجھنے کے خوگر بنے تو سب سے پہلی چیز جس کا انسان نے مشاہدہ کیا اور اس کی سمجھ میں آئی وہ اشیاء کا ربط باہمی اور اُن کی مرکزیت تھی۔ مجھے اس مرد کے ذہن پر رشک آتا ہے جو شہر کی گھما گھمی اور شور۔ پکار سے دور کسی گاتی ہوئی ندی کے کنارے اونچی چٹان پر بیٹھا ہوا گھنے درخت کے پیچھے غروب ہوتے ہوئے سورج کا نظارہ کر رہا ہے۔ درخت کے اَن گنت پتے۔ مشام روح کو معطر کرتے ہوئے پھول۔ ٹیڑھی بانکی لیکن متعلم حالیات کو دعوت نظارہ دینے والی شاخیں۔ دیکھنے والا محو ہو جاتا ہے لیکن اس کی فکر فوراً اس کو غلطی سے بچاتی ہے۔ پھول پتے۔ اور شاخ کی طرف سے اس کی نگاہ کو ہٹا کر درخت کی جڑوں کی طرف متوجہ کر دیتی ہے اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ اگر کسی نے اس جڑ کو قطع کر دیا تو ڈالیوں کی یہ شادابی۔ پتوں کا یہ نکھار۔ پھولوں کی یہ شگفتگی کس طرح باقی رہے گی۔

سورج نے اپنی آخری کرنیں اس کے منہ پر ڈالیں۔ درخت کی جڑ پر غور کرنے والا ڈوبتے سورج میں محو تفکر ہو گیا۔ اس کے سامنے فضائے محیط کی دنیا چکر کھانے لگی ستارے اور سیارے زبان حال سے کچھ گفتگو کرنے لگے اور وہ سمجھنے لگا کہ دنیا والوں کے لئے ڈوبنے والا یہ سورج اگر بیچ میں ڈوب

جائے اور کرو بیوں کے لئے کوئی مرکز باقی نہ رہے تو ساری کائنات یا کم از کم ہمارے نظام شمسی کا کیا حال ہوگا۔

سورج ڈوب گیا۔ آسمان پر سیاہی دوڑ گئی دور کی چیزیں نگاہوں سے محو اور نزدیک کی چیزیں دھندلی پڑنے لگیں شفق کی دھیمی روشنی میں ندی کی پیشانی اب بھی چمک رہی تھی اور اس سے کاٹ کر نکالی ہوئی چھوٹی چھوٹی نہریں کھیتوں میں بل کھاتی ہوئی دور دور تک نظر آ رہی تھیں۔ ہمارا فلسفی سوچنے لگتا ہے کہ اگر کسی نے ندی کے دہانے کو بند کر دیا۔ اور اس مرکز پر قفل لگا دیا۔ جہاں سے چشمے پھوٹ پھوٹ کر دریا بنے تھے تو نہ صرف میرے سامنے بہتی ہوئی ندی اور اس کے دامن سے تڑپ کر نکلتی ہوئی نہریں بلکہ ان سے سینچے جاتے ہوئے کھیت ان کھیتوں سے پیدا ہوتے والے غلے ان غلوں سے پرورش پانے والے کسان۔ ان کسانوں سے معاملت کرنے والے تاجر اور ان تاجروں سے خرید کر لطف زندگی اٹھانے والے شہریوں کا کیا حال ہوگا۔

ذات زیادہ جاچکی تھی۔ کائنات کی حقیقتوں پر غور کرنے والا چلا اٹھتا ہے کہ عالم ارض و سماکی فطرت مرکزیت ہے۔ اور انسان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ فطرت پر پیدا کیا گیا ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ فطرت پر پیدا ہونے کے باوجود ہمیشہ فطرت سے بغاوت کرنے والا انسان ولستان فطرت میں بیٹھنے کے باوجود۔ کتاب فطرت سے بالکل ناآشنا انسان۔ آنکھ رکھنے کے باوجود۔ اندھا انسان۔ کان رکھنے کے باوجود۔ بہرہ انسان۔ اگر قدرت کی ان ساری تلقینوں کو بھلا دیتا ہے اور اپنے فکر و نظر اور کردار و افعال میں مرکزیت پر انفرادیت کو ترجیح دیتا ہے اور اس پر اگر ہوا قہقہہ لگاتی ہے۔ پانی کھل کھلا کر ہنس دیتا ہے۔ ابر رو پڑتے ہیں اور

سورج کی آنکھیں حیرت سے کھل جاتی ہیں تو کوئی تعجب کا مقام نہیں

رسالہ "بزم مہدویہ"
زیر نگرانی مولوی کرم علی خان صاحب
بی۔اے' ایل۔ایل۔بی (عثمانیہ)

جنوری ۱۹۲۱ صفحہ ۱۲۔

فن تقریر

(مقدمہ)

مجھے اس بات کا ہمیشہ ملال رہا ہے کہ فن تقریر جیسے ضروری اور اجتماعی زندگی کے لئے لازمی فن پر اُردو زبان میں اچھی کتابیں نہیں ملتیں۔ کوئی شک نہیں کہ تقریر کا ملکہ قدرت کی عطا ہے لیکن چند خاص ضابطوں پر عمل کرنے سے اس ملکہ کو ترقی دی جا سکتی اور تقریریں زیادہ جاذبیت پیدا کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً مبتدیوں کے لئے اس قسم کی ہدایات بہت مفید ثابت ہوتی ہیں۔ میں نے اس وقت فن تقریر پر بعض کتابیں پڑھیں۔ جب میری تقریریں خاصی مقبول ہو چکی تھیں اور میرے اپنے تجربے نے اس فن کے چند اصول مرتب کر لئے تھے۔ پھر بھی مجھے ان کتابوں کے مطالعہ سے فائدہ پہنچا۔

قابل مبارکباد ہیں ہمارے نوجوان دوست رحیم الدین صاحب ظہیر آبادی جنھوں نے اپنی انشاء پردازی اور تالیف کی ابتداء اس فن شریف کے مطالعہ اور تدوین سے کی ہے۔ جب انھوں نے مجھ سے پہلی مرتبہ ملاقات کی تو ان کی ذہانت۔ سنجیدگی اور معاملہ فہمی نے مجھے متاثر کیا تھا اور آج میں اپنے تاثر کو زیادہ پختہ محسوس کر رہا ہوں۔ پھر ان کے مستقبل کی درخشانی کا یقین رکھتا ہوں۔ ان کی یہ ابتدائی کوشش ہر طرح استحسان اور ہمت افزائی کی مستحق ہے۔

اور وہ پہلا زینہ ہے جو ہمیشہ آنے والوں کو یا اپنے وسیع تجربہ کے بعد خود اُن کو اس سے زیادہ مکمل اور اس سے زیادہ مبسوط تالیف پر آمادہ کرے گا۔ سلیس اور عام فہم انداز میں اس کتاب میں تقریر کی تقریباً تمام اصناف سے بالاختصار بحث کی گئی ہے اور ضروری باتیں جمع کردی ہیں جو ایک مبتدی کے لئے ضروری ہوسکتی ہیں۔ اچھے مقرروں کے بغیر ایک قوم گونگی ہوتی ہے۔ اور ہم کو ابھی بہت سے اچھے مقرروں کی ضرورت ہے مجھے یقین ہے کہ ہمارا مستقبل جن مقرروں کو پیدا کرے گا۔ یہ کتاب اُن کے لئے شمع راہ ثابت ہوگی۔

بہادر یار جنگ

مہدوی منزل
بیگم بازار

خطابیات
شیخ رحیم الدین کمال ظہیر آبادی
اپریل ۱۹۴۱ء
مطبوعات ادارۂ ادبیات اُردو۔

"شاعر کا قلم"

تاریخ عالم شاہد ہے کہ انقلاب عالم میں خطیب کی زبان - مجاہد کی تلوار اور مدبر کے دماغ کے ساتھ شاعر کا قلم بھی کام کر رہا ہے - شاعر اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے - اور کاغذ پر اپنے فکر و تامل کا نچوڑ چند منظوم الفاظ میں مرتسم کر دیتا ہے بعض دفعہ وہی چند الفاظ روح عمل اور حیات ملل بن جاتے ہیں - مبارک ہیں وہ لوگ جو قدرت کے اس عطیہ کو آلہ نشاط بنانے کے بجائے سبب حیات بنا لیتے ہیں - ہر چیز کی طرح شاعری کی ابتداء اور انتہا میں فرق ہوتا ہے لیکن کسی اچھی چیز کی ابتداء بہر حال قابل استحسان ہے -

مدرس اتحاد المسلمین

جناب جعفر اللہ صاحب جعفری

دیہاتی زبان کا شاعر

(پیش لفظ)

دکن کی سرزمین اُردو شاعری کے لئے ہمیشہ اچھا گہوارہ ثابت ہوئی۔ عادل شاہی۔ قطب شاہی اور آصف جاہی درباروں نے اس کو پروان چڑھانے میں پورا حصہ لیا اور آج ہم دکن کو اردو ادب کا ایک اہم مرکز دیکھ رہے ہیں۔ گزشتہ دس بارہ سال میں جدت پسندی اور ضرورت نے ایک نیا راستہ پیدا کیا اور بعض شاعروں نے دکن کی دیہاتی زبان میں جو قدیم دکھنی اور موجودہ ترقی یافتہ اردو کا درمیانی دور کہا جاسکتا ہے۔ طبع آزمائی شروع کی۔ ان میں سب سے نمایاں مولوی نذیر احمد دہقانی ہیں جنھوں نے اپنے انقلابی خیالات کو دیہاتی زبان کے پردے میں چھپاکر دکھنی شاعری کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کیا۔ تخیل کی بلندی۔ معانی کی رفعت۔ محاورات ضرب الامثال کی بندش اور ان سب کے ساتھ جدید رجحانات کی تلقین ان کے کلام کی خصوصیات ہیں جن کا لطف کچھ وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو دکن کی دیہاتی زبان سے آشنا ہوں۔ گو ان کے کلام کا حقیقی لطف اُن کی زبان سے سن کر ہی آسکتا ہے لیکن مجھے توقع ہے کہ وہ اپنی تحریری شکل میں بھی بہت مقبول ہوگا۔ دہقانی صاحب شستہ اور با محاورہ اردو میں بھی قادر الکلام ہیں۔ مجھے ان کے ایسے کلام کی اشاعت کا بھی انتظار رہے گا۔

احقر العباد
محمد بہادر خان عفی عنہ

نوائے دہقانی
مرتبہ حشمت رضا آرکٹکٹ

مرکزیت اور اجتماعیت
(قائد ملت کا پیام)

متلاشی نگاہیں جب ختمی مرتبت محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برگزیدہ تعلیم کا مذاہب سابقہ سے مقابلہ کرتی ہیں تو جو خصوصیت سب سے پہلے اور سب سے آخر میں بے نقاب ہوتی ہے وہ اسلام کی مرکزیت اور اجتماعیت ہے وہاں فرد ملت بلا ربط ملت کوئی وجود ہی نہیں رکھنا چاہیئے۔ عبادات میں ہو یا معاملات میں اخلاقیات میں ہو یا سیاسیات میں اسی حقیقت کبریٰ کو شاعر حیات علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے اس طرح بیان کیا ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

ایک زمانہ تھا کہ خود ذات قدسی صفات حضرت سید الکائنات ربط ملت کے لئے رشتہ وحدت تھی لیکن آج جب کہ زمانہ ان رشتوں کے رنگ اور روپ کو بدل چکا ہے ملت اسلامیہ کی حیات اجتماعی کا مدار اسی پر ہے کہ اپنے ایک یا زیادہ افراد کو کامل غور و فکر کے ساتھ اپنی فلاح و بہبود کا ضامن بنا کر چنیں اور ان سے منسلک ہو جائیں یہ حقیقت اب کسی دلیل کی محتاج نہیں رہی کہ

"اتفاق میں نصرت دین ہے اور نفاق میں ہزیمت"

آج مسلمانان دکن کی حیات اجتماعی کی ذمہ دار "مجلس اتحاد المسلمین"

ہے اسی سے منسلک اور متعلق رہنے میں ان کی اجتماعی وسیاسی فلاح ونجات اور اس سے ہٹ کر گروہ بندی میں ان کے لئے ہلاکت وعذاب ہے۔

مسلمانو۔ مجلس اتحاد المسلمین کے ہوجاؤ اور اس کو اپنا بنا لو وہ جدھر چلائے ادھر چلو اور وہ جو کہے وہ کرو۔ وہ بگڑے تو اس کو سدھارو لیکن اس سے ہٹ کر کسی اور طرف نہ دیکھو کہ اس وقت زمانہ کی سب سے بڑی پکار "مرکزیت" ہے فقط

(نواب بہادر یار جنگ بہادر)

جلد ۹ نمبر ۵	خلیق اتحاد المسلمین نمبر
مقام اشاعت	صفحہ نمبر ۳ تا ۴
حیدرآباد	ذی الحجہ ۱۳۵۸ ہجری

اخبار اور پریس کی دنیا

(پیام)

بیسویں صدی کو جہاں اور بہت سے نام دیئے جاسکتے ہیں وہاں اس کو اخبار اور پریس کی دنیا کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ حمل و نقل کے ذرائع اور سفر و سیاحت کے وسائل نے دنیا کی طنابیں کھینچ دیں اور ایک قوم کو دوسری قوم سے۔ ایک ملک کو دوسرے ملک سے اتنا قریب کردیا ہے کہ اب ہمارا معاملہ صرف ہمارا معاملہ نہیں بلکہ دنیا کے تمام بسنے والوں کی دلچسپی کا مسئلہ بن گیا ہے یہی وجہ ہے کہ کوئی قوم اخبار و پریس کو اپنے ہاتھ میں رکھے بغیر دنیا کو اپنی حقیقت سے باخبر نہیں رکھ سکتی۔

حیدرآباد میں یوں تو اردو کے بہت اچھے اچھے اخبار ہیں۔ لیکن انگریزی زبان میں کوئی ایسا اخبار نہیں جس کو ملک کے جذبات و احساسات کا صحیح ترجمان کہا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد کے باہر رہنے والے جو انگریزی زبان کے ذریعہ معلومات حاصل کرتے ہیں۔ حیدرآباد کے مسئلہ کو صحیح طور پر سمجھنے سے قاصر اور افترا پردازیوں کا شکار ہونے پر مجبور ہیں۔ ضرورت تھی اور شدید ضرورت تھی کہ ملک کے مخلص فرزندوں میں سے کوئی اٹھتا اور اس کمی کو پورا کرتا۔ ہم سب کو ممنون ہونا چاہئے۔ مولوی سید اسد اللہ صاحب بی۔ اے کا کہ انھوں نے اس طرف

دوبارہ توجہ کی۔ سید اسد اللہ صاحب ایک تجربہ کار جرنلسٹ ہیں۔ ان کا اخبار اپنے پہلے جنم میں ملک کا مقبول اور ہر دل عزیز اخبار رہ چکا ہے۔ ہم کو یقین ہے کہ وہ اپنے اس آرگن کے ذریعے ملک کے بسنے والوں کو صلح و آشتی اور پریم و محبت کا درس دیں گے۔ اصلاح و ترقی کے صحیح راستے سمجھائیں گے۔ غلط کاریوں سے بچانے کی کوشش کریں گے اور ملک کے باہر بسنے والوں کے سامنے حیدرآباد کی وہ صحیح اور مکمل تصویر پیش کریں گے جو تعلق اور طرفداری کی گل کاریوں اور بغض و عناد کی سیاہیوں سے پاک ہو۔ میں دل سے نیو ایرا کا اس کی اس دوسری زندگی میں خیر مقدم کرتا ہوں اور حیات کامیاب و جاوید کا متمنی ہوں۔

بنام جناب مولوی سید اسد اللہ صاحب بی۔اے
ایڈیٹر نیو ایرا۔ نظام شاہی روڈ۔ حیدرآباد
۳۰؍ فروردی ۱۳۴۸ ف
م ۴؍ مارچ ۱۹۳۹ء

(قلمی مسودہ)

"اخبار وقت"

(پیش نظر)

مولوی عبد الرحمن صاحب (عثمانیہ) ایڈیٹر اخبار وقت ملک کے ان چند فرزندوں میں سے ہیں جن کا قلب ملک وملت کے لئے جذبات محبت و فدیت سے ہمیشہ معمور رہتا ہے۔ انھوں نے ان جذبات کی صرف قلب میں پرورش ہی نہیں کی بلکہ گزشتہ سترہ اٹھارہ برس میں اپنے ایثار و قربانی کے بہترین نمونے پیش کئے۔ تحریک خلافت میں اُن کی جرأت آمیز مساعی اور گزشتہ دس سال سے اخبار وقت کے ذریعہ مسلم عوام کے اذھان و افکار کی تربیت میں انھوں نے جو بے مثال حصہ لیا وہ ہم سب کے تشکر و امتنان کا مستحق ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اخبار وقت کی بندش اُن کی مساعی حسنہ کیلئے مانع ثابت نہ ہو گی۔ مجھے یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ اُن کے بعض مقالوں کا مجموعہ وقت کی یادگار کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے یقین ہے کہ مسلم پبلک اس کی قدر کرے گی اور اُن کو اس امداد کے ذریعہ زیادہ خدمات کا موقع دے گی فقط

محمد بہادر خان

نوائے وقت

منجانب ہمدردان اخبار وقت۔ صفحہ نمبر (۱) — ۳۴۸ ف

نظر حیدرآبادی

(تعارف)

عہد عثمانی میں دکن نے علم و ادب میں جو ترقی کی اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ یہاں بعض اچھے نوجوان شاعر پیدا ہوئے انھیں میں سے ایک نظر حیدرآبادی ہیں۔ یوں تو شاعری اُن کو ورثہ میں ملی ہے لیکن فطرتاً ان کے اندر وہ سب جراثیم پائے جاتے ہیں جو ایک اچھے شاعر کے لئے ضروری ہیں ان کا حال بھی کچھ کم درخشاں نہیں مگر مجھے یقین ہے کہ ان کا مستقبل ان کے حال سے زیادہ درخشاں ہوگا۔ مجھے یہ سن کر مسرت ہوئی کہ ان کا پہلا کلام شائع ہو رہا ہے۔ میں اس کی مقبولیت کی توقع رکھتا ہوں فقط

خرمن مجموعہ کلام نظر حیدرآبادی
ناشر مکتبۂ ابراہیمیہ

"فرشتۂ رحمت"

(تبصرہ)

کتاب فرشتۂ رحمت دیکھنے پر میں مجبور کیا گیا۔ میری مصروفیت ناول بینی جیسے مشاغل کے مانع ہے۔ اسی وجہ سے میں نے پوری کتاب دیکھنے اور اس پر تبصرہ کرنے سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔ حسبنہٗ میں نے تو کتاب کو چھوڑنا چاہا مگر فرشتہ رحمت نے ختم کتاب تک مجھے نہ چھوڑا۔ افسوس کہ جس قدر اس میں مشرقی اور خصوصاً اسلامی اخلاقیات کا غیر معمولی دلچسپی کے ساتھ نقشہ کھینچا ہے۔ اسی قدر کاتبین اکرام کو اغلاط کی بھرمار کرنے کا مختار مجاز کر دیا گیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں فرشتۂ رحمت پڑھنے والے کے لئے "فرشتۂ زحمت" بن گیا ہے کاش یہ خرابی نہوتی اور میں دل کھول کر اس کی خوبیوں پر تبصرہ کرتا۔

فرشتۂ رحمت (ناول)

از سید ضمیر احمد نقوی راز

مطبوعہ انتظامی پریس حیدرآباد۔

نصب العین

(تاثرات)

کسی قوم کی ترقی ایک نصب العین کے تعین اور نصب العین کے متعلق شعور عامہ کی بیداری پر منحصر ہے۔ بحمداللہ باشندگان حیدرآباد نے اپنا نصب العین معین کرلیا جو میرے الفاظ میں " وسیع تر۔ عظیم تر۔ بیرونی و اندرونی مداخلتوں سے پاک اور کامل آزاد حیدرآباد " ہے۔ لیکن اس طرف ہم اس وقت تک صحیح قدم نہیں اٹھا سکتے جب تک عوام اس نصب العین کی حقیقت اور اس کے مالہ وما علیہ سے باخبر نہ ہو جائیں۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی یہ مختصر رسالہ ہے جو مولوی مرزا مظفر بیگ صاحب مالک مکتبہ ابراہیمیہ و رکن مجلس شوریٰ اتحاد المسلمین مملکت آصفیہ اسلامیہ کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے اس میں آپ کو کوئی نئی چیز نہ ملے گی۔ اور آپ ان ہی مضامین کو دوبارہ پڑھیں گے جو آپ نے آج سے پہلے پڑھے ہوں گے۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ایک ہی بات دو مختلف زمانوں میں اس وقت کے حالات کے اعتبار سے دو مختلف قسم کی کیفیات پڑھنے والے کے قلب و دماغ میں پیدا کرتی ہے۔ آپ نے جس وقت ان مضامین کو پڑھا تھا اس وقت آپ کا ملک اور دنیا ان حالات سے نہیں گزر رہے تھے جن حالات سے آج گزر رہے ہیں۔ اس وقت یورپ میں

کوئی مہیب جنگ نہ تھی اس وقت دنیا کا نقشہ اس طرح جلد جلد نہیں بدل رہا تھا - اس وقت ہندوستان کے لئے مقبوضاتی مرتبہ اس طرح متعین نہیں ہو چکا تھا جیسا کہ آج ہز ایکسیلنسی وائسرائے اور وزیر ہند کے بیانات بابت ۸-۹-۱۴ر اگسٹ ۱۹۴۰ء نے کر دیا ہے - اس وقت حیدرآباد کا مستقبل اس طرح متعین نہیں تھا جس طرح آج مجلس اتحاد المسلمین کی یادداشت مورخہ ۱۶ر جمادی الثانی میں ہے - اس لئے مجھے یقین ہے کہ آج آپ ان مضامین کو پڑھیں گے تو اس سے زیادہ مستفید و متاثر ہوں گے جتنا آپ اس سے قبل ہوئے تھے -

دوسری طرف کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ

"تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہ گاہے باز خواں آں دفتر پارینہ را"

بہر حال میں محترم مرزا مظفر بیگ صاحب کو ان کی کوششوں کے لئے مبارکباد دیتا ہوں اور ہر فرزند حیدرآباد سے متوقع ہوں کہ وہ ان مضامین کو غور سے اور سمجھ کر پڑھے گا -

احقر العباد
محمد بہادر خاں عفی عنہ

آزاد حیدرآباد - مرتبہ مرزا مظفر بیگ حیدرآباد دکن
صفحہ ۱ تا ۲ - عید الاضحیٰ ۱۳۵۹ ہجری

مذہب اور سیاست

(تقریظ)

دنیا آج کل سیاسی نظریوں کا اکھاڑہ بنی ہوئی ہے ۔نئے نئے سیاسی مذاہب پیدا ہو رہے ہیں اور اپنا مقام پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کشمکش میں خود مسلمانوں نے اس ربانی نظام سیاست کو فراموش کر دیا جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے نبی امی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا کو دیا گیا تھا۔ بیسویں صدی عیسوی اور چودھویں صدی ہجری مسلمانوں کے لئے بڑی نیک فالوں کے ساتھ آئی کہ اس نے ایک مرتبہ پھر ان کو قرآن اور قرآن والے نبی کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں اسلام کی صحیح اسپرٹ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ حلقہ بگوشان اسلام نے جمہوریت - اشتراکیت - اشتمالیت - فاسطیت - نازیت اور گاندھیت کے اس طوفان میں ایک مرتبہ پھر ربانی سیاست کی مشعل روشن کرنے کا عزم کر لیا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب سے میرے دیرینہ تعلقات ہیں - وہ میرے مدرسہ اور میدان عمل کے شریک رہے ہیں اور ایک زمانہ تک اتحاد المسلمین کی مجلس عاملہ ان کے مشوروں سے مستفید ہوتی رہی - ان کا دینی شغف علمی کاوشیں اور سنجیدہ مذاق ہم سب کے لئے قابل تقلید ہے وہ ملک کے ان

چند افراد میں سے ہیں جن سے مجھے عقیدت کے درجہ تک پہونچی ہوئی محبت ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین سے مختلف اوقات میں عہد نبوت کی سیاسی تاریخ کے مختلف گوشوں کو نمایاں کیا اور آج میری نظر سے ان کا ایک نہایت مفید مقالہ گزرا جس کا عنوان "اسلامی حکومت کے معنے" ہے۔ عنوان کا تقاضہ تو یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب اس پر ایک مکمل کتاب تالیف فرماتے لیکن اس مختصر مضمون میں انھوں نے اسلامی تعلیمات کے سمندر کو کوزہ میں بند کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور نہ صرف قرانی تعلیمات کا احاطہ کیا ہے بلکہ عہد محمدی سے قبل کی اسلامی سیاست کو بھی مقالہ کی تمہید میں قرآنی حوالوں سے ظاہر فرمایا ہے۔ جیساکہ انھوں نے خود فرمایا ضرورت ہے کہ اصحاب فکر ان نقاط پر تفصیلی مضامین لکھیں۔ تاہم یہ مقالہ معلمین سیاست کے لئے ایک واضح نشان راہ ثابت ہوگا۔ اور منزل تک پہونچنے میں سنگ میل کا کام دے گا۔

مجھے اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب کی رائے سے صرف ایک مقام پر اختلاف ہے۔ وہ تسلیم فرماتے ہیں کہ "مذہب کے اگر وسیع معنے لئے جائیں تو اس میں پورا تمدن اور دنیا و آخرت کے جملہ مسائل شریک ہوجاتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اسلامی حکومت کے معنے بتاتے ہوئے نہ معلوم کیوں مذہب کے محدود معنے کو اختیار کرنا ضروری خیال فرمایا اور مذہب اور سیاست دونوں کو ایک سمجھنا غلطی قرار دیا ہے۔ خود ان کی پیش کی ہوئی آیات قرآنی سے یہ امر صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ مذہب انسانی زندگی کے ایسے راستہ کا نام ہے۔ جو اپنی ہر منزل میں انسان کو اللہ کا خلیفہ اور زمین کا وارث بننے کا مستحق بنا دے۔ مذہب کا مقصد ہی یہ ہے کہ ایمان کے ذریعہ انسان میں عمل صالح کی صلاحیت پیدا کرے۔ اور خدا کے اس صالح بندے کو استحقاق وراثت ارض دلائے اگر مذہب

کے معنے محدود ئے جائیں اور اس کو صرف خدا اور بندے کے تعلقات کے لئے مختص کر دیا جائے اور بندے کے بندوں کے ساتھ تعلقات کو اس کے حدود عمل سے خارج کر دیا جائے تو پھر مذہب کے احکام سے عقاید اور عبادات کے سوا ساری تعلیمات کو کاملاً اور خود عبادت کے بعض اجزاء کو خارج کر دینا پڑے گا - اور نماز کی جو افضل عبادات ہے یہ خوبی سمجھ ہی میں نہ آئے گی کہ وہ کس طرح فحشاء اور منکر سے بچانے والی ہو سکتی ہے - قرآن کی تعلیمات تو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ انسان کی آفرینش کا اولین مقصد زمین میں خدا کی خلافت ہے اور اس خلافت کا انحصار اس پر ہے کہ خدا کا زیادہ صالح بندہ اس کے دوسرے بندوں کو اس کے احکام کا پابند رکھنے کی کوشش کرے اور یہ ڈاکٹر صاحب کے اختیار کئے ہوئے محدود معنے سے کبھی پورا نہیں ہو سکتا -

اس جزوی مگر اصولی اختلاف سے قطع نظر میں اس مضمون کے مطالعے کو اسلامی سیاست کے سمجھنے کی کوشش کرنے والوں اور صحیح اسلامی حکومت کے قیام کی تمنا رکھنے والوں کے لئے بہت مفید سمجھتا ہوں اور ڈاکٹر صاحب سے متوقع ہوں کہ وہ مسلمانوں سے یہ خواہش نہ فرمائیں -

"تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل"

بلکہ ان کی تفصیلات پر قلم اٹھائیں اور ایک مکمل خاکہ اسلامی حکومت کا دنیا کے سامنے پیش کریں - کیا تعجب ہے کہ لامذہبیت اور مغربیت کی اس گھٹا ٹوپ تاریکی میں وہ کلبۂ رہبان کی قندیل کا کام دے اور سیاسی کشمکش کے اس دور میں عقل و فکر کے گنجان جنگلوں میں بھٹکتے ہوئے انسان کو منزل مقصود تک پہونچا دے فقط

منقول - اسلامی حکومت - از ڈاکٹر حمید اللہ سابق استاد قانون جامعہ عثمانیہ

ناشر - دائرۃ الاصلاح حیدرآباد دکن -

"شمع ہدایت"

(تقریظ)

کیا کسی قوم کی اس سے بڑھ کر اور کوئی بدقسمتی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی جیب میں اکسیر رکھتی ہو اور پھر بھی دین و دنیا کے امراض میں مبتلا رہے مجھے عالم انسانیت کی وہ مصیبت یاد ہے جب کہ آج سے تیرہ سو برس قبل معاشرت ہی نہیں بلکہ اس کی روح بھی ہر قسم کے امراض قبیحہ کا شکار تھی حکیم مطلق اور خالق کائنات نے اس کی بے بسی پر رحم کھایا اور اپنے سب سے اچھے اور آخری رسول محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ وہ نسخہ شفاء اولاد آدم کو عطا فرمایا جس کی تعمیل کے نتائج دنیا نے حیرت و استعجاب کی آنکھوں سے دیکھے دنیا کے پست اٹھے اور معراج کمال کو پہنچ گئے عالم کے ذلیل جن کے لئے کوئی مقام ہماری معاشرت میں باقی نہ رہا تھا۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ کا سہارا لے کر قیصر و کسریٰ کے دعوی ہمسری کرنے لگے بے وسیلہ عورت نے اپنے سر سے ردائے ذلت اتار کر مرد سے آنکھ ملا کر کہہ دیا کہ اب اپنی بیجا بڑائی رہنے دو قرآن کریم نے هُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ کا پیغام سنا دیا ہے۔

جب تک یہ حبل متین مسلمانوں کے ہاتھ میں اور یہ شمع ہدایت ان کے سامنے رہی وہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کی بشارتوں سے پوری طرح بہرہ اندوز ہوتے

رہے اور جس وقت سے اعراض کیا فَاِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا کی وعید سے شکار ہیں - ہم سب حضرت مولانا شاہ عبد الحامد صاحب قادری بدایونی کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اپنے بلدہ کے قلیل قیام میں جو کثرت مجالس وعظ و ارشاد سے محیط تھا کم از کم مدت میں انتہائی محنت و کاوش سے "دعوت عمل" جیسا جامع اور پر از معلومات مجموعہ مرتب فرمادیا بلا شبہ مولانا نے جو آیات بھی درج فرمائی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک آیت ہماری زندگی کے لئے مفید لائحہ عمل ہو سکتی ہے وَلَوْ كَانُوا يَعْقِلُونَ - مولانا کی اس عمیق محنت کا کچھ وہی حضرات اندازہ کر سکتے ہیں۔ جن کو قرآن کریم میں ڈوبنے کا موقع ملا ہے - مولانا نے جو عنوانات قرار دئیے ہیں وہ ایسے فاضل کا کام تھا جو نہ صرف قرآن کریم پر گہری نظر رکھتا ہو بلکہ وقت کی اہم ضروریات سے بھی پوری طرح واقف ہو - میں مولانا کے لئے جزائے خیر اور مطالعہ کرنے والوں کے لئے رب رحیم و رحمٰن سے توفیق نیک کا امید وار ہوں۔

بہادر یار جنگ

۱۴ ر مہر ۱۳۴۳ ف م ۲۷ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ

دعوت عمل

از مولانا عبد الحامد بدایونی

مقام اشاعت حیدرآباد

صفحہ د - ز

شانِ نزول

(رائے)

۱۲ ارامرداد ۱۳۵۱ ف
م ۱۸ ار جون ۱۹۴۲ ء

ناندیڑ کے مدرسہ تفسیر القرآن کا میں نے پھر ایک مرتبہ معائنہ کیا۔ جتنی دفعہ میں اس مدرسہ کو دیکھتا ہوں اتنا ہی میری مسرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مولوی ابو یوسف صاحب کی کوششیں ہر طرح قابل تشکر و مبارک باد ہیں۔ طلباء کی تعداد اس وقت ۸۵ ہے۔ میں نے حسب عادت ان کا اچھی طرح امتحان لیا اور یہ دیکھ کر خوش ہوا کہ کم عمر سے کم عمر اور بڈھے سے بڈھے طالب علم نے قرآن مجید کو سمجھ کر اور شان نزول سے واقف ہو کر پڑھا ہے۔ مجھے زیادہ مسرت یہ دیکھ کر ہوئی کہ اس مدرسہ کے طلباء کو قرآن شریف کے ذریعہ عربی زبان پر عبور ہوتا جارہا ہے۔ میں نے الفاظ کو مختلف صورتوں میں بدل کر اس کے معنیٰ پوچھے اور خود طلباء سے ایک لفظ کو مختلف صیغوں اور ابواب میں تبدیل کروایا اور دیکھا کہ ہر طالب علم اس کے لئے تیار تھا۔

میں نے پہلے بھی محسوس کیا تھا اور آج بھی میرا خیال ہے کہ اتنے زیادہ طلباء کو ایک مدرس کسی طرح تشفی بخش تعلیم نہیں دے سکتا۔ نیز ضرورت ہے کہ اس مدرسہ کے لئے ایک علیحدہ مکان ہوتا کہ وہاں اطمینان کے ساتھ تدریس کو جاری رکھا جاسکے اس لئے میں صدر انجمن اسلامیہ کے معتمد صاحب سے متوقع ہوں کہ وہ اس مدرسہ کی امداد میں کافی اضافہ فرمائیں اور آئندہ سال کے موازنہ میں اسکے لئے ایک معقول گنجائش نکالیں فقط

(قلمی مسودہ)

اِصلاحی خدمات

میں ممنون ہوں مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی نے اپنے قائم کردہ مدارس شبینہ کے معائنہ کا مجھے موقع دیا۔ حیدرآباد کی خالص اصلاحی خدمات میں یہ اپنی قسم کی بہترین علمی کوشش ہے کہ آوارہ مسلمان لڑکوں اور کم فرصت کاروباری افراد کو رات کے چند گھنٹوں میں ارکان مذہب سے واقف کرایا جائے اور ان میں سچا مذہبی ذوق پیدا کیا جائے۔ ہمارے یہاں دوسرے ممالک متمدنہ کے برخلاف تعلیم بالغان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی حالانکہ اس کے فوائد تعلیم اطفال سے کچھ کم نہیں۔ مولوی صاحب کو اس اہم اور مفید تحریک کے سرکاری امداد کے بغیر جاری کرنے میں جن دشواریوں سے سابقہ پڑا وہ حوصلہ شکن تھیں لیکن ان سے سر بر ہو کر ایک حد تک اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جانا یقیناً قابل مبارکباد ہے۔ دوسری طرف یہ سخت افسوسناک ہے کہ حیدرآباد جیسے اسلامی مرکزی مقام میں مولوی صاحب کی امداد کما حقہٗ نہ ہوئی۔ اور مالی مشکلات کی وجہ سے مولوی صاحب کا کام ادھورا ہے۔

مدارس شبینہ دکن و تعلیم بالغان

مرتبہ لقاء اللہ عثمانی

۲۵ر صفر المظفر ۱۳۵۰ ہجری م ۱۲ر جولائی ۱۹۳۱ء

حج بیت اللہ

جب میں نے ادائی حج بیت اللہ کا قصد کیا تو میرے نزدیک سب سے اہم مسئلہ معلم کے انتخاب کا تھا میں نے اپنے احباب مولوی الحاج ڈاکٹر خواجہ معین الدین صاحب و مولوی الحاج فیض الدین صاحب وکیل و مولوی الحاج قادر محی الدین صاحب وغیرہ سے مشورہ کیا اور سب نے بالاتفاق بدرالدین سیف الدین کا نام لیا۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص سے کسی کو آرام پہنچتا ہو وہی شخص دوسرے کے لئے باعث زحمت ہو جائے لیکن الحمد اللہ جب مجھے بدر الدین صاحب اور اُن کے بھائی حسین سیف الدین صاحب سے عملی سابقہ پڑا تو میں نے اُن کو جو کچھ سنا تھا۔ اس سے بہت بہتر پایا۔

لوگ کسی کے متعلق رائے قائم کرنے میں عجلت کرتے ہیں میرے خیال میں کسی کی خدمات کے جانچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم غور کریں کہ ہم خود اس کی جگہ ہوتے تو کیا ہم اس کام کو اس خوبی سے انجام دے سکتے۔ سفر حج میرے خیال میں انسانی اخلاق و برتاؤ کی سب سے بڑی امتحان گاہ ہے۔ اس کی ہر ایک منزل انسان کے جوہر اصلی کے آگے سے تصنع اور تکلف کا ایک ایک پردہ اٹھاتی ہے اور حضرت انسان اپنی پوری حقیقت کے ساتھ اپنے ساتھیوں کے سامنے نمایاں ہو جاتے ہیں ایسے موقع پر دو تین سو مختلف طبائع و امزجہ رکھنے والوں کو آرام پہنچانے کی ذمہ داری اپنے سر لینا حقیقت میں ایک

بڑی جرأت ہے منیٰ اور عرفات کی تپتی ہوئی دھوپ میں ننگے بدن شغادف اور اونٹوں کا انتظام کرتے ہوئے ان دونوں بھائیوں کو دیکھ کر مجھے کئی دفعہ رحم آیا اور میں نے خدا کا شکر کیا کہ اس نے مجھے معلم نہیں بنایا ان معلمین نے حتی الامکان ہر حاجی کو آرام پہنچانے کی کوشش کی اور آرام پہنچایا۔ بعض غریب اور مسکین حجاج کی قابل قدر مالی امداد کی۔ اس کے باوجود بھی اگر کسی کو آرام نہیں ملا تو میں اس میں اُن کا قصور نہیں سمجھتا۔ ان دونوں بھائیوں کے اخلاق پسندیدہ عادات پاکیزہ طرز نرم اور محبت قابل قدر ہے خدا اُن کو اچھا رکھے اور آں دیار حبیب میں عاشقان خدا کو آرام پہنچانے والوں کو ہر تکلیف دینوی و اخری سے بچائے فقط

ماہنامہ انیس الغرباء
مدیر خواجہ بدر الدین
مقام اشاعت حیدر آباد
ماہ رمضان المبارک ۵۵ ۱۳ھ
صفحہ (۷)۔

فنونِ لطیفہ

۲۵؍شہریور ۱۳۵۱ف
مطابق ۳۱؍جولائی ۱۹۴۲ء

(رائے)

میں خان بہادر سید احمد صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے مدرسہ فنون لطیفہ کے دیکھنے کی دعوت دی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت و مسرت ہوئی کہ حکومت کی ابتدائی امداد سے اس قلیل عرصہ میں اس مدرسہ نے کتنے مفید کام انجام دیئے ہیں۔ فن مصوری کو حرفتوں کی تعلیم کا ذریعہ بنانا خان بہادر صاحب کی جدت اور ملک کی مصنوعات کے لئے ایک اچھا شگون ہے۔ انھوں نے فن مصوری کے ہر طالب علم کے لئے کسی نہ کسی حرفت (CRAFT) کو لازمی قرار دیکر اس کو مجبور کر دیا ہے کہ اپنی بہترین فکر کو ملکی مصنوعات کی ترقی اور اصلاح میں صرف کر دے۔ اس سے یقیناً توقع کی جا سکتی ہے کہ آئندہ ملکی مصنوعات کو بہت فائدہ پہونچے گا۔ میں نے مدرسہ کے کارخانوں میں بیدری سامان۔ ہمرو۔ نجاری اور سینگ کے کام کا معائنہ کیا۔ خصوصاً سینگ کے کام پر خان بہادر صاحب کی توجہ میری مسرت کا باعث ہوئی کیونکہ یہ صنعت ہماری بے توجہی سے ختم ہو رہی تھی۔

اس مدرسہ میں بعض پہلو ایسے بھی ہیں جن کو میں مذہباً جائز نہیں سمجھتا اس لئے اس قدر درخواست کرنا اپنا فرض اور حکم امر بالمعروف کی تعمیل تصور کرتا ہوں کہ اگر مصوری کو مناظر قدرت اور بے جان اشیاء تک محدود رکھا جائے اور مجسمہ سازی کی

بدعت سے حیدر آباد کو جہاں خود بادشاہ کا مجسمہ نہیں بنتا۔ محفوظ رکھا جائے تو مناسب ہوگا۔

طالبات کے لئے گو خان بہادر صاحب نے خود اس کی احتیاط برتی ہے کہ ان کی جماعتیں علٰحدہ ہوں لیکن آئندہ اس کے لئے مکان بھی علٰحدہ کر دیا جائے تو ہماری مشرقی اور مذہبی روایات کے عین مطابق ہوگا۔

آخر میں خان بہادر صاحب کو اُن کی مساعی جمیلہ کے لئے مبارکباد دیتا ہوں۔ فقط

(قلمی مسودہ)

نیا قرآنی قاعدہ

"میں نے شیخ چاند صاحب بی۔ اے مولف "بولتا قاعدہ" کی دوسری تالیف "نیا قرآنی قاعدہ" بہت غور سے دیکھا مجھے یقین ہے کہ اس وقت تک جتنے قرآنی قاعدے لکھے گئے ہیں یہ قاعدہ ان سب سے بہتر ہے۔

اس کتاب کی ترتیب بچے کے فہم کے مطابق اور ایسی بتدریج ہے کہ دماغ پر غیر ضروری بار دے اور حافظہ پر زیادہ زور ڈالے بغیر بچہ قرآن کے طرز تحریر سے آشنا ہونے لگتا ہے اور اس کو ختم کرتے کرتے نہایت آسانی کے ساتھ قرآن پڑھنے کے قابل ہو سکتا ہے۔

میں شیخ چاند صاحب کو اس مفید تالیف کے لئے دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔"

رہبر دکن

۲۶ مہر ۱۳۵۲ ف م

۲ ستمبر ۱۹۴۳ء

تفسیر

تفسیر و تاویل تفسیر کا مادہ فُسُر سے مشتق ہے اور فُسُر چھپی ہوئی چیز پر سے پردہ اُٹھانے یا اس کو ظاہر کرنے کو کہتے ہیں۔ اور جہاں کسی آیت میں جملہ یا لفظ کی تفسیر کی جائے تو یہاں اس کے معانی معقولہ کا بیان کرنا مراد ہے پس ہر وہ طریقہ جس سے کوئی شئی یا اس کے معانی معلوم ہوں وہ تفسیر ہے۔ بعض نے صرف مفرد و غریب الفاظ کے معنیٰ بیان کرنے ہی کو تفسیر کہا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں تفسیر لفظ تفسیرۃ سے مشتق ہے اور تفسیرۃ وہ دلیل ہے جس میں غور کرکے طبیب مرض کا پتہ چلا لیتا ہے۔ پس اسی طرح مفسر آیات اور ان کی شان میں غور کرکے معانی و اسرار و حقائق کو معلوم کر لیتا ہے۔

تاویل اول سے مشتق ہے اور اول کے معنی اصل کی طرف رجوع کرنے کے ہیں۔ پس تاویل بھی معانی آیت اور الفاظ آیت کے وجوہ مستنبطہ کا بیان کرنا ہے لیکن تفسیر و تاویل میں فرق ہے کہ تفسیر منقولات سے آگے نہیں بڑھتی اور تاویل عقل و فہم کی بھی محتاج ہوتی ہے۔

استعاذہ یا تعوذ استعاذہ کے الفاظ پسندیدہ و مروجہ "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" ہیں جو آیت شریف "فاذا قرأت القرآن فاستعذ باللہ من الشیطان الرجیم" سے ماخوذ ہیں۔ اعوذ باللہ کے معنیٰ ہیں "پناہ طلب کرتا ہوں میں اللہ کی" اور یہ عاذ یعوذ سے ہے شیطان لفظ شطن سے مشتق ہے،

اس کے معنے ہیں وہ جو رحمت سے دور کر دیا گیا ہو۔ بعض نے اس کو شاطالشیط سے مشتق بتایا ہے کیونکہ وہ غصہ سے جل گیا اور ہلاک ہو گیا۔ شیطان اسم ہے ہر اس جنس و انس کے لئے جو سرکش متکبّر ہو۔ لیکن یہاں وہ شیطان جن مراد ہے جو آگ کی قوت سے پیدا کیا گیا۔ اسی لئے اس میں قوت غضبی زیادہ ہے۔ لفظ رجیم کو بعضوں نے فعیلؒ کے وزن پر بمعنی فاعل پڑھا ہے اور اس کے معنیٰ وسوسہ ڈالنے والے کے لئے ہیں۔ اور بعض مفعولؒ کے معنے میں پڑھ کر اس کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ بارگاہ رب العزت سے مردود ہونے کے بعد جب وہ آسمان کی باتیں دریافت کرنے کے لئے اوپر کی طرف چڑھتا ہے تو اس کو فرشتے شہاب ثاقب سے مار کر نیچے دھکیل دیتے ہیں، اس لئے اس کو رجیم کہا گیا۔ اور اکثروں نے اس کے معنی مطرود اور مردود کے لئے ہیں کہ اللہ جل شانہٗ نے آدم ؑ کو سجدہ نہ کرنے کی سزا میں اس کو اپنی بارگاہ سے نکال دیا۔ اور اس کو رحمت و خیر اور درجات ملأ اعلیٰ سے محروم کر دیا۔

تفسیر سُورۂ فاتحہ

اس سورۃ میں سات آیتیں ہیں اور ستائیس کلمات اور ایک سو چالیس حروف ہیں۔ اس کے مقام نزول میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ وہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ لیکن مجاہد اس کے مدینۂ شریفہ میں نازل ہونے کے قائل ہیں۔ بعض علماء نے مکہ اور مدینہ میں دونوں جگہ اس سورۃ کے نازل ہونے کو مانا اور اس کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ دو وقت نازل کرنے سے اس کے علوم تربت اور عظمت شان کا اظہار مقصود تھا۔

اس سورۃ کے کئی نام ہیں پہلا فاتحۃ الکتاب۔ یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ اس سے قرآن شریف اور اس کی کتابت شروع ہوتی ہے اور اسی کو نماز میں بھی دوسری آیات قرآنی سے قبل پڑھا جاتا ہے۔

دوسرا نام اس کا ام القرآن ہے۔ ہر چیز کی اصل کو ماں کہا جاسکتا ہے چونکہ سورۂ فاتحہ بھی قرآن شریف کی اصل ہے اس لئے اس کو ام القرآن کہا گیا۔

تیسرا نام سبع المعانی ہے۔ سبع اس لئے کہ اس میں ۷ آیتیں ہیں اور اس لئے کہ نماز میں وہ دہرائی جاتی ہے۔ اس لئے کہ بعض علماء کے قول کے مطابق وہ دو دفعہ نازل ہوئی ہے۔

چوتھا نام سورۃ الحمد ہے۔ کیونکہ اس میں سورہ کی ابتداء حمد باری سے کی گئی ہے۔

پانچواں نام الوافیہ - وافیۃ کامل اور پورے کو کہتے ہیں۔ چونکہ نماز میں یہ سورۃ پوری پوری پڑھی جاتی ہے - اور اس کو دوسری صورتوں کی طرح نصف ایک اور نصف دوسری رکعتوں میں پڑھنا جائز نہیں ہے اس لئے اس کا نام وافیہ رکھا گیا۔

اس کا چھٹا نام کافیہ ہے - اس لئے کہ اس کا نماز میں پڑھ لینا نماز کی تکمیل کے لئے کافی ہے - دوسری صورتیں اگر نہ پڑھی جائیں تو صرف سجدۂ سہو کر لینے سے نماز ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے بجائے دوسری سورۃ پڑھ لی جائے اور اس کو ترک کر دیا جائے تو نماز ہرگز نہیں ہوتی - اس لئے اس کو کافیہ بھی کہا جاتا ہے۔

اس کا ساتواں نام سورۂ شفا بھی ہے کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اس کو پڑھ کر دم کرنے سے بیماریاں دفعہ ہو جاتی ہیں۔ اس نام کو صاحب لباب نے نہیں بیان کیا - علامہ شمسی مرحوم نے اپنی تفسیر لوامع البیان میں اس کا ذکر کیا ہے۔

فضائل سورۂ فاتحہ

اس سورۂ مبارکہ کے فضائل میں کئی حدیثیں وارد ہوئی ہیں - حضرت ابوسعید ابن المعلےٰ حضرت ابوہریرہ اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہم کی احادیث سے ثابت ہے کہ یہ سورۃ ایسی باعظمت و مرتبت ہے کہ اس کی مثل کوئی سورۃ نہ تو قرآن شریف میں کوئی ہے نہ توراۃ و انجیل میں۔ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی صورت نازل فرمائی تھی - حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی نماز اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی جب تک کہ سورۂ فاتحہ اس میں نہیں پڑھی جائے - اور اسی حدیث میں حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ سورۃ میرے اور میرے بندے کے درمیان تقسیم ہے - نصف میری جانب اور نصف میرے بندے کی جانب - جب بندہ

الحمد للہ رب العالمین کہتا ہے تو پروردگار فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری تعریف کی اور جب بندہ الرحمن الرحیم کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے میری ثنا و بیان کی بندے نے اور جب مالک یوم الدین کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے بندے نے میری بزرگی بیان کی اور کبھی فرماتا ہے بندے نے مجھے اپنے کام سونپ دیئے۔ کیونکہ قیامت کا دن یوم حساب ہے۔ اور اس دن بندوں کے سارے اعمال خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں سونپ دیئے جاتے ہیں اور جب بندہ ایاک نعبد و ایاک نستعین کہتا ہے تو پروردگار فرماتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے کیونکہ اس میں خدا کی ربوبیت اور اپنی عبدیت کا اظہار مشترک طور پر کیا گیا ہے اور خدا کو قابل استعانت اور اپنے آپ کو عاجز ظاہر کیا گیا۔ اور جب بندہ اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم ولا الضالین کہتا ہے تو پروردگار فرماتا ہے کہ یہ میرے بندے کے لئے۔ اور ہر وہ چیز میرے بندے کے لئے جو اس نے مانگی۔

اس حدیث شریف سے ظاہر ہے کہ یہ سورۃ شریف جامع اور افضل السور ہے کیونکہ اس میں خدا کی حمد و ثنا اس کی ربوبیت اور قدرت کے اقرار کے ساتھ ساتھ دعائے صراط مستقیم بھی شامل ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم تسمیہ کا با، حرف جار ہے اور اس کے بعد جو الفاظ واقع ہوئے ہیں وہ سب

یہ ترکیب نحوی کا قاعدہ کلیہ ہے کہ جار و مجرور متعلق ہوتے ہیں کسی فعل یا شبہ فعل سے لیکن فقط اس جملہ میں کوئی ایسا متعلق نظر نہیں آتا اس لئے مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں ابدأ یا اقرأ محذوف و مضمر ہے یعنی اقرأ باسم اللہ یا ابدا باسم اللہ پڑھتا ہوں میں یا شروع کرتا ہوں خدا کے نام سے بسم اللہ اصل میں باسم اللہ تھا

الف قرأت میں سہولت پیدا کرنے کے لئے ساقط کر دیا گیا اور بسم اللہ رہ گیا بعض دفعہ یہ اعتراض کیا جاتا ہے آیت شریف فسبح باسم ربك العظیم میں الف کیوں باقی رکھا گیا۔ اس کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ آیت مذکور اور ایسی ہی دوسری آیتیں قرآن مجید میں شاذ شاذ مقامات پر آئی ہیں جہاں الف کا لکھنا کوئی ایسا بار نہیں ہے۔ لیکن تسمیہ کہ وہ وقت اور ہر کام کی ابتداء کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے اور لکھا جاتا ہے ضرورت تھی کہ اس کی قرأت کو حذف الف کے ذریعہ سہل بنایا جاتا بحذف الف اور لکھا بھی جاتا۔ چنانچہ یہی ہوا۔

تسمیہ کی تفسیر لکھتے وقت ایک اور بحث پیدا ہوتی ہے یاء کو بجائے سیدھے طریقہ پر (بسم اللہ) لکھنے کے بلند کر کے اسطرح کیوں لکھا جاتا ہے (بسم اللہ) اس کا جواب بعض نے یہ دیا ہے کہ الف کو حذف کرنے کے بعد اس کی بلندی باء کو جو ایک پست حرف ہے دیدی اور اس کو بجائے ب کے ب لکھا گیا۔ بعض نے کہا کہ اس حرف سے قرآن کی ابتدا ہوتی ہے اس لئے اس کو شاندار بنانے کے لئے اس طرح لکھا جاتا ہے اور اس کے ثبوت میں حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی ایک تاکید نقل کی کہ وہ اپنے کاتب سے ہمیشہ فرمایا کرتے کہ باء کو طول دیکر سین کو ظاہر کرکے اور میم کو مدور لکھا کرو تاکہ کتاب اللہ کی تعظیم ہو سکے۔

لیکن ہمارا خیال ہے یہ سب قیاسات ہیں۔ رسم الخط ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں جو خط حضرت رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا اگر اس کی ایک سطر اس وقت ہمارے سامنے رکھ دی جائے تو ہم کو اس کے پڑھنے میں تکلیف ہوگی جیسے جیسے زمانہ بدلتا گیا خط میں بھی تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ جن کی وجوہ کو تفصیل سے گنانا تقریباً محال ہے

اسم بعضوں نے اسم کو عین اور ذات مسمیٰ کہا ہے اور اس کی دلیل میں

آیت قرآن انا نبشرك بغلام اسمه یحییٰ اور اس کے بعد کا وہ حصہ جس میں حضرت یحییٰؑ کو یا یحییٰ کہہ کر مخاطب فرمایا گیا ہے پیش کی ہے اور استدلال کیا ہے کہ یحییٰ اگرچہ اسم ہے لیکن جب اس لفظ سے پکارا جائے تو اس سے مسمیٰ کا عین اور اس کی ذات ہی مراد ہوتی ہے۔ صاحب لباب فرماتے ہیں کہ یہ قول ضعیف ہے اور اس کے برخلاف صحیح اور پسندیدہ مذہب یہ ہے کہ اسم مسمیٰ کی ذات و عین کا غیر ہے کیونکہ اسم وہ لفظ ہے جس سے کسی شئے کی ذات پہچانی جاتی ہے اور وہ اصوات مقطعہ اور حروف مولفہ کا ایک ایسا مجموعہ ہے کہ وہ آلہ ہے کسی چیز کو پہچاننے کا۔ پھر کسطرح درست ہو سکتا ہے مسمیٰ یعنے شئی معلوم اور اسم یعنے آلۂ علم دونوں ایک ہوں۔ اگر یہ درست ہوتا تو پھر ایک چیز کا ایک ہی نام ہوتا حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض وقت ایک شئے کے کئی نام اور بعض وقت ایک نام کی کئی چیزیں ہوتی ہیں مثلاً پروردگار عالم کہ وہ ایک و یکتا ہے مگر اس کے وہ اسماء حسنیٰ ہیں اور بہادر خان کہ سیکڑوں افراد افاغنہ کا نام ہے اور ہو سکتا ہے۔

آیت شریفہ انا نبشرک بغلام اسمہ یحییٰ کا عین و ذات ہونے کی دلیل میں غلط طریقہ پر پیش کیا گیا ہے۔ حالانکہ خود اسی آیت سے اسم اور مسمیٰ کا غیر ہونا ثابت ہو رہا ہے۔ اگر اسم اور مسمی ایک ہوتے تو ارشاد ہوتا بغلام ہو یحییٰ بجائے اس کے اسمہ یحییٰ فرمایا گویا یحییٰ الگ چیز ہے اور ذات یحییٰ الگ شئی جو اسم کے ذریعہ پہچانی گئی۔

اشتقاق اسم لفظ اسم کے اشتقاق میں بھی اختلاف ہے۔ بصرہ کے علماء کا خیال ہے لفظ اسم سُمُوٌّ سے مشتق ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ یعنی اسم اس قدر بلند ہوا کہ اپنے مسمی پر چھا گیا اور اس کا علم بن گیا۔ اور

کوفیوں کا قول ہے کہ اسم اسمۃ "سے مشتق ہے جس کے معنی علامت کے ہیں گویا وہ مسمیٰ کی علامت ہے۔ لیکن کوفیوں کا قول صحیح نہیں تھا جب کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسم کی تصغیر سُمَیّ" اور اس کی جمع اسماء آتی ہے۔ حالانکہ اگر اس کی اصل اسمۃ ہوتی تو اس کی تفسیر وُسَیْم "اور جمع اوسام آنا چاہیئے تھا۔ توضیح حسب ذیل ہے۔
سمو سُمُوٌ کی تصغیر سُمَیْوٌ" ہوگی لیکن اس میں واؤ جمع ہوا اور ماقبل ساکن تھا اس لئے واؤ کو ی سے بدلا گیا سُمَیِیٌ" ہوا اور دونوں یاء مدغم ہو کر سُمَیٌّ" ہوئے برخلاف اس کے اگر سِمَۃ" کی تصغیر وُسَیْمٌ" ہو تو سُمَیٌّ" کسی طرح نہیں آسکتا۔

اللہ یہ اسم اللہ تعالیٰ کا علم ہے اور اسی ذات واجب الوجود کے لئے مختص اس نام میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا۔ ھل تعلم لہ سَمِیًّا یعنی اس کے سوا کسی اور کو اس نام سے مخاطب نہیں کیا جاسکتا۔
اس کے اشتقاق بھی اختلاف ہے۔ بعض کا قول ہے کہ وہ کسی لفظ سے مشتق نہیں ہے لیکن بعضوں نے اس کے چار اشتقاق بیان کئے ہیں۔

۱۔ اِلٰھۃ" ۔ یعنی مستحق عبادت اس کا ماضی مضارع اَلَہَ یاْلَہُ
۲۔ الوَلَہُ ۔ وھو الفزع ۔ یعنی ساری مخلوقات اپنی احتیاجات کے باعث اس کی طرف جھکتی ہے اور اس سے خوف کھاتی ہے۔
۳۔ اَلَہٌ" سے کہا جاتا ہے یعنی مجھ اس کے پاس سکون ہوا۔
۴۔ وِلَاہٌ" ۔ واؤ مکسور ہمزہ سے بدل کر اِلٰہٌ" ہوگیا ہے اور وہ اس وجہ سے ہر مخلوق اس کی والہ ہے۔

اس اسم مقدس کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگر اس کے حروف میں سے ایک یا بعض حذف بھی کر دیئے جائیں تو وہ بامعنی باقی رہ جائے گا۔

مثلاً الف نکل جائے تو لِلّٰہ رہ جاتا ہے۔ اور اگر کوئی ایک لام نکل جائے تو اِلٰہٗ۔ اور اگر الف اور دونوں لام بھی نکال لئے جائیں تو پھر بھی ضمہ کو واو سے بدلنے پر ہو رہ جائے گا۔

بعضوں کا خیال ہے کہ یہی اسم اعظم ہے اور پروردگار کا وہ نام ہے جو اس کی ذات پر دلالت کرتا ہے۔ برخلاف دوسرے اسماء کے وہ اس کے صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔

الرحمٰن الرحیم یہ دونوں پروردگار عالم کے اسماء صفاتیہ ہیں اور ہم معنی ہیں یعنے "رحمت والا" اور یہ دونوں اسماء تاکید کی غرض سے اور بندوں کو خدا کی طرف ترغیب دلانے کی غرض سے یکجا استعمال کئے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ان دونوں کے معنے میں فرق ہے خصوصیت و عمومیت کا۔ الرحمٰن کے معنی رزاق فی الدنیا کے ہیں یعنے کافۃ الناس پر بلا خصوصیت مومن و کافر اس کی رحمت رزق عام ہے۔ اور رحیم کے معنی قیامت و آخرۃ میں مومنین پر راحم و بخشش کرنے والے کے ہیں۔ اس لئے بعضوں نے رحمٰن الدنیا و رحیم الآخرۃ بھی کہا ہے۔ رحمت ارادۂ احسان و خیر کو کہتے ہیں۔ جو اپنے والوں پر کیا جائے۔ یا اس کا مطلب مستحق عقاب سے عقاب کا دور کرنا اور غیر مستحق احسان و خیر پر احسان و خیر کرنا بھی ہو سکتا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ رحمٰن مصائب کے دور کرنے والے کو اور رحیم گناہوں کے بخشنے والے کو کہتے ہیں۔

"قائدِ اعظم کی تقاریر"

(مقدمہ)

دارالاشاعت سیاسیہ نے مجھ سے خواہش کی ہے کہ قائدِ اعظم ملت اسلامیہ ہند مسٹر محمد علی جناح مدظلہٗ العالی کے تقاریر و بیانات کے اس مجموعہ پر مقدمہ لکھوں۔ دارالاشاعت کی یہ خواہش ایک طرف میرے لئے انتہائی مسرت و عزت کا موجب ہے تو دوسری طرف پریشانی کا بھی۔ کیونکہ نہ قائدِ اعظم محتاج تعارف ہیں نہ اُن کے بیانات و تقاریر محتاج تبصرہ۔ ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا آدمی ان کے خیالات سے واقف ہے اور دس کروڑ مسلمان ان کی قیادت پر فخر کر رہے ہیں۔ میری اس تحریر کا منشاء صرف یہ ہوگا کہ ان تقاریر و بیانات کے مطالعہ کنندگان کے سامنے مسلمانانِ ہند کی موجودہ قیادت کے ان رجحانات کو پیش کروں جو تدریجی طور پر گزشتہ دس برس میں ترقی پاتے رہے ہیں۔

ہندوستان میں سب سے پہلی مرتبہ انگریزوں کی حکومت نے تصورِ جمہوریت کو روشناس کیا۔ ہندوستان کی تاریخ کا متعلم جانتا ہے کہ بادشاہت دنیا میں کسی اور جگہ اس شدت و اقتدار کے ساتھ قائم نہیں رہی جتنی ہندوستان میں رہی تھی۔ ہندو مذہب کی کتابیں بادشاہ کی عظمت و مرتبہ کا پتہ دیتی ہیں۔ فرعونِ مصر نے بزعم خود غلط خدائی کا دعوےٰ کیا تھا لیکن ہندوستان کے راجہ آج تک خدا کی حیثیت سے پوجے جا رہے ہیں۔ ہندو مذہب نے بادشاہ کو خدا کا مظہر قرار دیا اس کی

اطاعت خدائی احکام کی تعمیل کے برابر تصور کیگئی۔ اور اس کا انکار یا اس سے سرتابی دنیا کا سب سے بڑا گناہ سمجھی جاتی رہی۔ یہ تصورات صرف ہندو راجاؤں کے ساتھ قائم نہیں رہے بلکہ اسلامی سلطنت کے قیام کے بعد خود مسلمان بادشاہوں کی نسبت سارے مذہبی اختلافات کے باوجود ہندو رعایا کا تصور یہی رہا جب انگریزوں نے ہندوستان میں جمہوریت کو روشناس کیا تو ہندوستان کے حالات بدل چکے تھے تقریباً ایک ہزار سال کی اسلامی حکومت نے ہندوستان میں اسلامی تہذیب و تمدن کی جڑیں مضبوط کر دی تھیں۔ اور آریائی باشندوں کی طرح ہندوستان مسلمانوں کا مستقل وطن بن گیا تھا اور ہندوستان کا کوئی صوبہ ایسا نہ تھا جہاں مسلمانوں کی قابل لحاظ آبادی موجود نہ ہو ممکن نہ تھا کہ مسلمانوں کو پھر سے ڈھکیل کر ہندوستان سے باہر نکالا جائے یا بدھ مت کی طرح اسلام کو ہندوستان سے خارج کیا جائے اس لئے جمہوریت ہندو سیاسی زعماء کے نزدیک پھر سے ہندو اقتدار کو زندہ کرنے کا ایک اچھا ذریعہ سمجھی گئی۔ اور انھوں نے اس کا دل سے خیر مقدم کیا اور جو تدریجی اصلاحات ہندوستان میں جاری ہوئیں ان میں پورے جوش کے ساتھ حصہ لینا شروع کیا۔

مسلمان اپنی حکومت کھو کر نہ صرف مال و دولت کے اعتبار سے مفلس ہو چکے تھے۔ بلکہ ان کے ذہنی انتشار نے فکر و عمل کے لحاظ سے بھی ان کو مفلس بنا دیا تھا۔ جمہوری تحریک کے سیلاب میں دوسروں کے ساتھ بہنے لگے اور اسی نقطۂ نظر سے اپنے مستقبل کا جائزہ لینے لگے ۱۹۳۵ء تک ہندوستان کی ساری سیاسی تحریک کی رجحان کے نتائج و عواقب میں جمہوریت مسلمانوں کے لئے یوں بھی جاذب توجہ ہو گئی کہ اسلامی نظام حکومت بگڑ جانے کے بعد سلاطین کے استبداد نے مسلمانوں کو بادشاہت سے ایک حد تک بیزار کر دیا تھا۔ وہ پھر اس دور کی طرف دیکھتا

چاہتے تھے جب کہ عوام کو پوری آزادی کے ساتھ حق رائے دہی حاصل تھا اور خلیفۃ الرسول بھی ایک خمیدہ کمر و لرزہ بر اندام بڑھیا کی حق بات ماننے پر اور ایک کالے کلوٹے حبشی غلام کا ممبر خلافت سے جواب دینے پر مجبور ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے ملک کے خاص حالات کا جائزہ لئے بغیر ہندوستانی مسلمانوں نے بھی جمہوری نظام حکومت کا خیر مقدم کیا اور اس کا ساتھ دینے لگے۔

قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ان کی نگاہ دور بین نے ہندوستان کے خاص حالات کا جائزہ لیا اور دنیا کے عام تصور کے خلاف نہایت جرأت کے ساتھ اعلان کیا کہ جمہوریت ہندوستان کے لئے موزوں نظام حکومت نہیں ہے۔

تصور جمہوریت کا لازمی نتیجہ اکثریت و اقلیت کا سوال تھا جہاں ایک مذہب ایک نسل ایک زبان اور ایک تہذیب رکھنے والی قومیں آباد ہوتی ہیں۔ وہاں جماعت بندی سیاسی اختلافات کی بنیاد پر ہوتی ہے لیکن ہندوستان ایک ایسا ملک تھا جہاں ایک سے زیادہ نسلی مذہبی اور تہذیبی اختلاف رکھنے والی جماعتیں موجود تھیں اسی لئے جمہوریت کے روشناس ہوتے ہی یہاں سیاست کی بجائے مذہب و تہذیب کی بنیاد پر جماعت بندی شروع ہوئی اور اسی نقطۂ نظر سے اکثریت و اقلیت کے سوال پر غور کیا جانے لگا۔ اور ہندو زعماء نے نہایت تدبر و دور اندیشی کے ساتھ مسلمانوں کے ذہن و فکر کو مسموع کرنا شروع کر دیا کہ وہ ایک اقلیت ہے اور بد قسمتی سے خود مسلم زعماء نے تعداد کی قلت و کثرت کو معیار تفوق و کمتری قرار دیکر اپنی گتھیوں کا حل تلاش کرنا شروع کیا اس کا نتیجہ ۱۹۱۶ء کی ہندو مسلم مفاہمت تھی اسی نے ۱۹۲۶ء کی آل پارٹیز کانفرنس کو ناکام کیا اور اسی کے آخری نقوش کمیونل ایوارڈ کی صورت میں قانون حکومت ہند

۱۹۳۵ء پر مرتسم ہوئے۔ قانون مذکور کے نفاذ سے ۱۹۳۷ء میں جو صوبہ وار حکومتیں قائم ہوئیں اُن کے تقریباً تین سالہ دور نے ثابت کر دیا کہ یہ سارے نقوش پانی کی سطح پر بنے تھے مسلمان چونکا اور قائد اعظم نے اپنی قیادت کا دوسرا کامرتبہ کمال دکھلایا جب انھوں نے صاف طور پر اعلان کیا کہ دس کروڑ کی تعداد میں بسنے والی ایک جماعت جو ثقافتی اور مذہبی امتیازات کی حامل ہے ایک اقلیت نہیں بلکہ مستقل قوم ہے مالا یار ہل سے اترنے والے کلیم سیاست کے اس نعرے نے دو ڈھائی سامریت کے سارے طلسم کو توڑ دیا اور مسلمان کی آنکھ کے پردے یک بارگی چاک ہو گئے۔

کوئی قوم ذہنی انقلاب کے بغیر عملی انقلاب کی منزل تک نہیں پہنچ سکتی۔ جمہوریت نے بغاوت اور ایک مستقل قوم ہونے کے دعوے نے مسلمانوں کی فکر کے زاوئے درست کر دیئے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ ایک منزل مقصود اس کے سامنے رکھی جائے۔ سیرت نبوی کی اصطلاحوں میں اگر گفتگو کی جائے تو بلا تشبیہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں ایک مکی دور سے گزر رہا تھا اور اس کے لئے ایک ایسے مدینہ کی ضرورت تھی جہاں اپنے قدم جما کر وہ بدر و احد کی تیاری کر سکے اور خدائے قدیر سے "سلطان نصیر" کا اُمیدوار ہو سکے۔ محمد علی جناح نے آغوش مغرب میں تربیت پائی تھی ان کے دماغ کا ایک ایک گوشہ فکر مغرب کا مرہون منت تھا اور ان کے جسم کی ایک ایک پود تمدن مغرب کی آئینہ دار تھی لیکن ان کا نام محمد اور علی سے نسبت رکھتا تھا اس لئے ان کا دل فکر محمد اور عزم علی کے پر تو سے خالی نہ تھا۔ اعتباری اور اصطلاحی حیثیت سے چاہے انھوں نے تعلیمات محمدی سے کوئی بہرہ نہ پایا ہو لیکن ان کے قلب کی گہرائیاں روح تعلیمات محمدی سے محروم نہ تھیں وہ غیر شعوری یا نیم شعوری طور پر اسی طرف گئے جاھر ایک اصطلاحی

عالم دین شعوری طور پر جا سکتا۔ اور اعلان کیا کہ ہر قوم اپنے لئے ایک مستقر چاہتی ہے اور اپنے تہذیب و تمدن کو ترقی نہیں دے سکتی جب تک کہ کسی جگہ اپنے اختیارات کو کامل طور پر استعمال کرنے کے قابل نہ ہو اس لئے مسلمان ان علاقوں میں جہاں ان کی عددی اکثریت ہے ایک آزاد سلطنت چاہتے ہیں۔ یہی بنیاد ہے ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی گوشوں میں آزاد اسلامی حکومتوں کے مطالبہ کی جس کو ہندوؤں نے پاکستان کہا اور اب انہی کو جھلانے کے لئے انہی کی اصطلاح میں مسلمان بھی پاکستان کہتے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ صدیوں کی تفریق و تشتت کے بعد ہندوستان کے مسلمان پھر ایک مرکز پر جمع ہو گئے مذہبی اختلافات نے جو گروہ بندیاں پیدا کر دی تھیں ٹوٹ گئی ہیں۔ اور مسلمانوں نے ایک مدبر امیر کی قیادت میں اپنی منزل کی طرف بڑھنا شروع کیا ہے۔ میں قائد اعظم کے بیانات و تقاریر کے اس مجموعے کی اشاعت کو اس عہد کی سب سے بڑی علمی خدمت سمجھتا ہوں تاکہ مسلمان اس میں وہ سب کچھ ایک جا پائیں جو مختلف اوقات میں اُن کی نظر سے گزرا ہے اور اس نعمت کی قدر کریں جو خدا نے ان کو عطا کی ہے۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح کی صورت میں ہمیں ایک ایسا رہنما عطا کیا جبکہ کشتی امت اسلامی شب تار میں ہوا کے مخالف اور بحر طوفان خیز کے تھپیڑے کھا رہی تھی مجھے قائد اعظم کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ اور میں اپنے قلب و ضمیر کے کامل اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں ایک ایسے سپہ سالار کے کامل صفات موجود ہیں جو عقل و تدبیر کی اس جنگ میں عساکر اسلامیہ کو لڑا سکے۔ اب ہمارا کام ہے کہ ان کے اطراف جمع ہو جائیں اپنے باہمی اختلافات کو رفع کریں اور ان کے احکام و ہدایات کی تعمیل کر کے ان کے ہاتھوں کو مضبوط کریں اور منزل کو قریب تر لائیں۔ اور یاد رکھیں کہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے ؎ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(بہادر یار جنگ)

تقاریر جناح از عثمان صحرائی۔ دار الاشاعت سیاسیہ حیدرآباد صفحہ نمبر (۱۰ تا ۱۱)

Shaik Bodhan.
BOOK BINDER.
Resedent, Patther Ki Masjid,
16-3-985 Chanchalguda, Hyd-A, P.